مُلا دو پیازہ جیسے عوامی کردار کی تزک

تزکِ دوپیازی

ابنِ صفی

اسرار پبلی کیشنز

الکریم مارکیٹ، مین کبیر سٹریٹ
اردو بازار لاہور۔ فون: 7357022-7321970

اس ناول کے نام، مقام، کردار اور کہانی سے
تعلق رکھنے والے اداروں کے نام فرضی ہیں۔

پبلیشر............خالد سلطان
پرنٹر.............یمانی پریس

سیل ڈپو: عثمان ٹریڈرز
الکریم مارکیٹ، مین کبیر سٹریٹ
اردو بازار لاہور۔ فون: 7357022-7321970

پیش لفظ

"تزکِ دو پیازی" جس کے بارے میں ابنِ صفی کہتے ہیں
"بادشاہوں کی تزکیں آپ نے پڑھی ہوں گی۔ یہ ملا دو پیازہ جیسے عوامی کردار کی تزک ہے۔ جس کی طرف کسی نے بھی توجہ نہیں دی تھی"

"تزکِ دو پیازی" کے بارے میں ہمارا دعویٰ ہے کہ جب تک آپ اسے آخری سطر تک پڑھ نہیں لیتے، ہاتھ سے چھوڑ نہیں سکیں گے "عمران سیریز" اور "جاسوسی دنیا" کے مقبول کرداروں کی طرح "اس تزک" کے کردار بھی آپ کو جیتے جاگتے اور اپنے دل کی دھڑکنوں سے قریب تر محسوس ہوں گے۔

نسترن بانو کی شاطرانہ چالیں اور فیض الحسن کی بوکھلاہٹیں آپ کو بے اختیار قہقہوں اور حیرتوں سے دوچار کر دیں گی۔ انسانی نفسیات پر ابنِ صفی کی گرفت اور ان کے دلچسپ اندازِ تحریر کے سحر میں آپ کھو کر رہ جائیں گے۔ اس نایاب تحریر کا ہر لفظ آپ کو دل میں اترتا ہوا محسوس ہوگا۔

یہ کہانی "ابن صفی میگزین" کراچی کے ابتدائی
شماروں میں شائع ہوتی رہی ہے۔ جسے ہم جناب
مشتاق احمد قریشی کے شکریہ کے ساتھ پیش کر رہے ہیں۔

خالد سلطان

●

رہے نام اللہ کا اور اُس کے محبوبؐ کا۔ ان دو ناموں کے علاوہ اور ہر نام
فانی ہے اور ان اسمائے پاک کے علاوہ کسی اور نام کی کوئی حیثیت نہیں۔ نام
بدلا، حیثیت بدلی، پتہ نہیں میرا اصلی نام کیا تھا۔ اُس نام کے ساتھ کچھ اور تھا۔
جب مُلّا دو پیازہ کہلایا تو کچھ اور ہو گیا۔ میرا باپ میری صغر سنی ہی میں مفقود الخبر
ہو گیا تھا۔ ذرا ہوش سنبھالا تو یہ دیکھ کر بڑی کوفت ہوئی کہ باپ نہیں ہے۔
مُر چکا ہوتا تو صبر آ جاتا۔
سب سے زیادہ قلق اس بات کا تھا کہ کسی کا کچھ لے کر نہیں بھاگا تھا۔
نہ اس فرار میں کسی محبوب دل آرا کی چاہت کار فرما تھی۔ پڑوسیوں سے
روایت ہے کہ میری مادرِ محترمہ کی زبان بے لگام کا کُشتہ تھا۔ ایک دن بازار
سے روغن زرد کا ہنڈا سر پر رکھے گھر کی جانب پلٹ رہا تھا کہ نزلے کی تحریک
پر چھینک آئی۔ ہنڈا سر سے مراجعت کر کے سوئے زمین آیا۔ اور پاش پاش
ہو گیا۔ نقصانِ مایہ کہ تقدیری امر تھا، صبر کیا جا سکتا تھا، لیکن پدرِ بزرگوار
شماتتِ مادرِ محترمہ کی تاب نہیں رکھتا تھا، پھر پلٹ کر گھر نہ آیا۔
جب میں اس قابل ہوا کہ اس داستانِ رُوح فرسا کو مع سیاق و سباق
بہ حقیقت نیوشں کی اذیت کا سامان بنا سکوں تو مادرِ محترمہ کے عتاب

کی پروا کئے بغیر مَیں نے بھی مفقود الخبری کی ٹھان لی، لیکن حاشا وکلا اس میں مادرِ محترمہ کی طرف سے بیزاری کا شائبہ نہیں تھا۔ مَیں تو پدرِ بزرگوار کو تلاش کر کے یہ اطلاع دینا چاہتا تھا کہ چنگیز خان بھی بیوی سے ڈرتا تھا لیکن کبھی اس طرح پیٹھ نہیں دکھاتی تھی۔ میدانِ جنگ میں کُشتوں کے پُشتے لگا کر بیوی کے آگے بیٹھا گھگیایا کرتا تھا، اور قول اُس جوانمرد کا یہ تھا کہ وہ مرد ہی نہیں جو اپنی زوجہ سے ڈرتا نہ ہو۔

بعض دشمنوں نے اُڑا رکھی تھی کہ پدرِ بزرگوار بے مقصد غائب نہیں ہوا۔ اُس نے دوسری شادی کر لی ہے لیکن اس عاجز کے تئیں یہ سراسر الزام ہے۔ پدرِ بزرگوار ایک زوجہ سے بھاگ کر دوسری زوجہ کر لینے کی ہرگز جرأت نہیں رکھتا تھا اور پڑوسیوں کے بیان کے مطابق وہ تو اپنی زوجہ سے ڈرتے ڈرتے دوسروں کی زوجاؤں سے بھی ڈرنے لگا تھا۔ کوئی شادی تازہ ہوتے دیکھتا تو چیخ مار کر خاموش ہو جاتا اور پھر ہوش میں آتا تو یہی کلام زبان پہ ہوتا "پروردگار! اگر اسے مارنا ہی تھا تو کسی ریگستان میں مارا ہوتا، کانٹوں بھرے گلزار کے حوالے کیوں کر دیا؟"

دوسری شادی والی روایت کو غیر مستند سمجھتے ہوئے میں نے رختِ سفر باندھا اور عازمِ آکبرآباد ہُوا، کہ زمانے کے دستور کے مطابق زوجاؤں سے ڈر کر بھاگنے والے ادھر ہی کا رُخ کرتے ہیں اور شاہی لشکر میں بھرتی ہو جاتے ہیں۔ اک مردِ بزرگ نے تو یہاں تک بتایا کہ مرہٹوں کی فوج میں الیوں کو سپہ سالار بنا دیا جاتا ہے۔

قصہ کوتاہ میں کارواں سرائے کی طرف چل پڑا کہ وہیں سے کسی ایسے قافلے کا انتظار کروں جو آکبرآباد کی طرف جانے والا ہو۔ میری خوش نصیبی کہ انہی دنوں ملک التجار ثناء اللہ پارچی آکبرآباد کے لئے ایک کارواں

ترتیب دے رہا تھا اور اسے اپنے لئے کارپردازوں کی بھی تلاش تھی۔ . . .

ثناء اللہ پارچی مردِ معقول ثابت ہوا۔ پہلا سوال یہی تھا کہ میرا عزمِ سفر کسبِ زر کے لئے ہے یا تلاشِ حق کے لئے . . . ؟ میں نے عرض کیا، دونوں کے لئے نہیں ہے۔ میں تو اپنے باپ کی تلاش میں نکلا ہوں اور میں نے پوری داستان دھرا دی۔ اس مردِ معقول نے پھر سوا لاکھ کا سوال کیا کہ اے پسر! جب وہ تیری صغر سنی ہی میں نکل کھڑا ہوا تھا تو اسے پہچانے گا کیونکر . . . کیا تجھے اس کی شکل یاد ہے؟ مَیں نے کہا شکل تو یاد نہیں لیکن میری مادرِ محترمہ نے خاص پہچان بتاتی ہے، اور پھر اس کے استفسار پر میں نے بتایا۔ پہچان یہ بتائی ہے کہ اگر کان ذرا بڑے ہوتے تو بالکل گدھا معلوم ہوتا۔

یہ کلام سن کر ثناء اللہ پارچی بے اختیار رونے لگا اور میرے ہاتھوں کے توتے اُڑ گئے کہ خداوندا یہ کیا ہوا۔ جب وہ جی بھر کر رو چکا تو بولا "اے فرزند! یہ تو کوئی خاص پہچان نہ ہوئی جس کی زوجہ سے جی چاہے جا کر پوچھ لے، اس کے شوہر کی پہچان خدا نے چاہا تو یہی بتلائے گی . . . خیر تو ضرور چل میرے ساتھ اور منتظر رہ کہ مقدر کیا دکھاتا ہے"

اس طرح میرا آب و دانہ کُلّی طور پر وطن سے اُٹھ گیا۔

ثناء اللہ پارچی کے ساتھ لاکھوں روپے کا سامانِ تجارت تھا اور سولہ عدد جوان العمر اور طرح دار کنیزیں بھی تھیں۔ اس لئے بحفاظت آکبرآباد پہنچنا مطلوب تھا۔ جوان العمر کنیزوں کی وجہ سے اُس نے بوڑھے آزمودہ کار سپاہی بھرتی کئے تھے۔ پورے قافلے میں اس ہیچ مقدار کے علاوہ اور کوئی جوان آدمی نہیں تھا۔ سو بیچارہ ملک التجار بڑی تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا، ایک مردِ بامروت ہونے کے سبب زبان سے تو کچھ نہ کہہ سکا، لیکن قرائن سے معلوم ہوتا تھا

کہ مجھے حملوں کے آس پاس دیکھ کر اس کا نیچے کا سانس نیچے اور اوپر کا سانس اوپر ہی رہ جاتا ہے۔

آخر شام کو پڑاؤ ہوا اور ثناء اللہ پارچی نے مجھے اپنے خیمے میں بلوا بھیجا تھا۔ بصد محبت و اخلاص پیش آیا۔ اپنے سامنے والے غالیچے پر بیٹھنے کو کہا اور ٹکٹکی لگائے میری شکل تکتا رہا۔ پھر بولا۔

"اے فرزند! تو صرف خوش شکل ہی نہیں جامہ زیب بھی ہے۔" میں نے شرما کر سر جھکا لیا اور اس کی تسبیح کے دانوں کی کھٹا کھٹ خیمے میں گونجنے لگی، تھوڑی دیر بعد بولا۔ "تو زندگی کی اس منزل میں ہے کہ تجھے رات کو ٹھیک سے نیند نہ آتی ہوگی۔ بے چینی سے کروٹیں بدلتا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "یا حضرت خدا کا شکر ہے کہ گھوڑے بیچ کر سوتا ہوں، بے چینی کا تو دور دور تک نشان نہیں۔" یہ سن کر بے حد خرسند ہوا اور اُٹھ کر مجھے گلے لگاتا ہوا بولا۔ سبحان اللہ۔ . . تو اس مرضِ نامبارک سے بچا ہوا ہے، مگر یہ تو بتا، کیا جوان عورتوں کو دیکھ کر تیرے دل میں گدگدیاں نہیں ہوتیں؟"

میں نے دونوں کانوں پہ ہاتھ رکھ کر کہا "کبھی نہیں یا شیخ! مجھے تو متلی ہونے لگتی ہے جوان عورتوں کو دیکھ کر۔ البتہ اگر بوڑھی عورتیں"۔ . . . میں اپنی بات پوری کئے بغیر خاموش ہوگیا، لیکن شاید اس مردِ دانش مند نے دوسری بات پر توجہ دی ہی نہیں تھی۔ لہٰذا ایک بار پھر مجھے بغل گیر ہوتا ہوا بولا "جنت کی بشارت تیرے ہی جیسے نیکوکاروں کے لئے ہے۔"

میں اس کے توسط سے جنت کی بشارت لے کر اُس خیمے میں واپس آگیا جہاں کئی بوڑھے سپاہی حقّہ پی پی کر کھانس رہے تھے۔ دوسرے دن

پھر سفر شروع ہوا لیکن دوپہر بھی نہیں گزرے تھے کہ سفرِ آخرت کی نوبت آگئی۔ نہ جانے وہ رہزن کدھر سے آنکلے تھے اور اس طرح ٹوٹ پڑے تھے کہ بوڑھے سپاہیوں سے تلواریں تک نہ کھینچی گئیں۔ آن کی آن میں سب کھیت رہے اور ملک التجار زمین پہ اوندھا لیٹ گیا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی اور قتل ہونے سے بچ گیا۔

رہزنوں نے مال و اسباب پر قبضہ کر لینے کے بعد ہماری طرف توجہ دی۔ اُن کے سردار نے مجھ سے پوچھا کہ سوداگر کہاں ہے؟ میں نے بڑی صفائی سے جھوٹ بولا کہ وہ تو مارا گیا اور ہم دونوں بھٹیارے ہیں، قافلے والوں کے لئے کھانے پکایا کرتے تھے۔ اُس نے کہا کہ اب ہمارے لئے پکاؤ گے۔

ثناء اللہ پارچی نے بے بسی سے میری طرف دیکھا تھا اور میں نے اسے اشارہ کیا تھا کہ وہ خاموش ہی رہے۔ لیٹروں کا سردار سولہ عدد کنیزوں کو دیکھ دیکھ کر نہال ہو رہا تھا۔ آخر ہم سبھوں کو اس طرف لے چلا، جدھر سے آیا تھا۔ راستے میں عصر کی نماز کا وقت ہوگیا اور ان لیٹروں نے باقاعدہ اذان دے کر باجماعت نماز ادا کی۔

ثناء اللہ پارچی کبھی میری شکل دیکھتا اور کبھی میں اُس کے نورانی چہرے کو تکتا تھا۔ نماز کے اختتام پر لُٹیروں کے سردار نے کڑک کر ہم دونوں سے جواب طلب کیا کہ ہم دونوں نے نماز کیوں نہیں پڑھی۔ میں نے بڑے ادب سے عرض کیا کہ دیدہ دانستہ مکھی نہیں نگلی جا سکتی۔ کسی لیٹرے کے پیچھے نماز درست نہیں ہوتی۔

وہ حیرت سے میری صورت تکتا رہا پھر یک بیک میرے قدموں پہ گر کر بولا "یا حضرت! میرا قصور معاف فرمایئے، میں تو اسی توقع پہ قافلوں

میں لوٹ مار کیا کرتا تھا کہ کبھی نہ کبھی کسی ولی کامل سے ضرور ملاقات ہوگی۔ اور وہ مجھے راہِ راست پر لے آئے گا۔ سو اب میری طرف توجہ دیجئے تاکہ میرا آئینۂ دل دہر کی ناپاکیوں سے صاف ہو۔"

میری گھگی بندھ گئی۔ یہ احوال دیکھ کر اور قریب تھا کہ میں بھی جواباً اس کے قدموں پر گر جاتا کہ ثناء اللہ پارچی نے پیچھے سے ٹھوکا دیا اور میری بجائے خود بولا۔ "اے لیٹرے! میرے پیرو مرشد کے پاک قدموں سے اپنا ناپاک سر اٹھا اور دُور ہو جا۔"

لیٹرے پر گویا تی بجلی کوندی۔ بدحواس ہو کر کبھی میری شکل دیکھتا تھا اور کبھی ثناء اللہ پارچی کی۔ ۔ ۔ وہ بیر کہن سال مجھ اٹھارہ انیس سال کے لونڈے کو پیرو مرشد کہہ رہا تھا۔ ثناء اللہ پارچی نے اکڑ کر کہا "عمروں کے اس تفاوت کو حیرت سے نہ دیکھ۔ ۔ ۔ یہ مادر زاد ولی ہیں۔ پیدا ہوتے ہی شہد مانگا تھا۔"

لیٹروں کا سردار دھاڑیں مار مار کر رونے لگا اور پھر اُس کے پندرہ ساتھی بھی اس گریہ زاری میں آشریک ہوتے۔ آخر ثناء اللہ پارچی ہی کی مداخلت سے یہ شور نشور ختم ہوا اور ثناء اللہ پارچی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "خوش نصیب ہو تم لوگ کہ پیرو مرشد کے دستِ حق پرست پر تمہارا تائب ہو جانا مقدر ہو چکا تھا۔ پیرو مرشد پہلے ہی سے جانتے تھے کہ کیا ہونے والا ہے۔ لہٰذا خود بھی بھٹیارے بنے اور مجھے بھی بنا لیا لیکن سن لو کہ اس مالِ تجارت کا مالک میں ہوں۔ میں کہ ملک التجار ثناء اللہ پارچی کہلاتا ہوں۔"

وہ سب سناٹے میں آ گئے اور ان کا سردار گھگیا کر بولا "یا حضرت! اپنے پیرو مرشد سے عرض کیجئے کہ ہمیں تلقین کریں۔" میں نے انگشت شہادت کو آسمان کی طرف اٹھا کر اتنا ہی کہا کہ نیک بنو اور نیکی پھیلاؤ۔

انہوں نے اپنے سر جھکا دیئے اور پھر تھوڑی دیر بعد سردار اپنا سر اٹھا کر یوں گویا ہوا کہ اے خدا کے برگزیدہ بندے! ہم اپنی نیکی کی ابتداء نکاح سے کرنا چاہتے ہیں۔ ہم سب ابھی تک کنوارے ہیں۔

میرا ماتھا ٹھنکا کہ میں پہلے ہی ان کا شمار کر چکا تھا پورے سولہ عدد تھے۔ اور ثناء اللہ پارچی کی طرح دار کنیزوں کی تعداد سولہ ہی تھی۔ میں نے ثناء اللہ کی طرف دیکھا۔ اس کے نورانی چہرے پر بدلیاں چھانے لگی تھیں۔ وہ آہستہ سے بولا "یہ ناممکن ہے۔"

میں نے کہا "گردن کٹوانے کی بات نہ کرو۔ پھر بھی میں کوشش کرتا ہوں کہ وہ اس خیال سے باز آ جائیں۔" میں نے تجاہل عارفانہ سے کام لے کر ان سے کہا "ازدواج کے لئے زوجین کی ضرورت ہوتی ہے، یہاں تو صرف زوج ہی زوج نظر آتے ہیں۔" اس پر سردار نے کہا "یا ولی اللہ! محملوں میں ہمارے رشتے موجود ہیں اگر ہماری نیکی میں رخنہ پڑا تو ہم اپنے نیک بننے کی ضمانت نہیں دے سکیں گے۔"

میں نے کہا۔ "تو اچھا بقیہ مال میں تم ہاتھ بھی نہیں لگاؤ گے۔ نکاح کرو اور اپنا اپنا رستہ لو۔ میرا مُرید ان کنیزوں کو رہا کر دے گا۔ اور فرداً فرداً نکاح بھی پڑھائے گا۔ ثناء اللہ پارچی بڑے درد انگیز انداز میں کھنکار کر رہ گیا۔

بہر نوع ان نالائقوں نے یہ شرط منظور کر لی تھی۔ عجیب ہیں تقدیر کے کھیل۔ وہ عورتیں بھی مالِ تجارت میں شامل تھیں اور ثناء اللہ پارچی نے ان کا ہزاروں اشرفیوں کا تخمینہ لگایا ہوا تھا لیکن وہ یوں ہاتھ سے مفت نکل گئیں۔ اُن کے

مقدر میں تو نیکوکار لیٹروں کی بیویاں بننا تھا۔ بعد نکاح، لیٹروں کے سردار نے کہا۔ جب ہم نے نیک بننے کا ارادہ کر لیا ہے تو جنگل میں کس کے ساتھ نیکی کریں گے؟ ہم بھی کیوں نہ اکبر آباد ہی چلیں۔ بس! اُن سبھوں نے میرے ہاتھ پر بیعت کی اور مالِ تجارت کی نگرانی مثل چاکروں کے کرتے ہوئے اکبر آباد کی جانب چل پڑے۔

لیٹروں کا سردار زیادہ تر میرے ہمرکاب رہا تھا اور مجھے خاموش دیکھتا تو جھٹ سے گزارش کرتا کہ یا شیخ کچھ نصیحت فرمایئے!

کسی نہ کسی طرح اکبر آباد پہنچے اور وہ لیٹرے ہم سے جدا ہو گئے۔ ثناء اللہ پارچی بظاہر خوش دکھائی دیتا تھا لیکن مجھے علم تھا کہ اُس کا دل میری طرف سے صاف نہیں۔ ان طرحدار کنیزوں سے اس طرح دست بردار ہو جانا اُسے بے حد گراں گزرا تھا اور نہ جانے کیوں وہ اس کا سبب مجھے سمجھ رہا تھا۔ حالانکہ میں نے اپنی حکمتِ عملی سے نہ صرف اُس کا مالِ تجارت بچا لیا تھا بلکہ انہی لیٹروں کی نگرانی میں اُسے اکبر آباد لے آیا تھا۔

اُس مالِ تجارت کو بادشاہ کے سامنے پیش ہونا تھا۔ میں جو اس دوران میں خود کو سچ مچ مرشدِ کامل سمجھنے لگا تھا۔ ثناء اللہ پارچی کو کوئی مشورہ دینے بیٹھ گیا وہ ایک دم بھڑک اٹھا اور اس طرح گویا ہوا "اے ناہنجار! بس دور ہو جا میری نظروں سے۔ تیرے کہنے میں آ کر میں نے اپنی کنیزیں گنوائیں اور اب شاید تو مجھے میرے مالِ تجارت سے بھی محروم کرے گا۔ تیری نوکری ختم، چلتا پھرتا نظر آ۔"

"میں نے کہا "کچھ تو خوفِ خدا کرو، اگر مجھے بھٹیاروں والی بات نہ سوجھتی تو وہ تمہیں اسی وقت ختم کر دیتے۔" ثناء اللہ بولا کہ تو نے حقِ نمک ادا

کیا تھا۔ مجھ پر تیرا کوئی احسان نہیں۔ مجھے اس کی غلط بیانی پر غصہ آ گیا۔ اس وقت تو میں نے اُس کا نمک چکھا بھی نہیں تھا۔ وہی ستو کھاتا رہا تھا، جو میری مادرِ محترمہ نے ساتھ کر دیئے تھے۔ غصہ ضبط کر کے میں نے اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی لیکن بے سود۔ اُس نے دھکّے دے کر مجھے نکال باہر کیا۔ وہ لیٹرے اپنی ازواج سمیت پہلے ہی جا چکے تھے۔

اب میں تھا اور اکبر آباد کی گلیاں۔ کہیں سر چھپانے کی جگہ نہیں تھی، دن بھر اِدھر اُدھر بھٹکتا پھرتا اور رات کسی مسجد میں بسر ہوتی۔ کوئی ہنر پاس نہیں تھا کہ وہی ذریعۂ معاش بنتا۔ دو چار دن میں ساری پونجی کھا پی کر بیٹھ گیا۔ پونجی تھی ہی کتنی۔ پہلے ہی فاقے نے یہ حال کیا کہ ہر آدمی پدرِ بزرگوار سے مشابہ نظر آنے لگا۔ یعنی بقول مادرِ محترمہ کہ اگر کان ذرا بڑے ہوتے تو گدھا نظر آتا۔

دوسرے دن جب بھوک کے مارے یہ حال تھا کہ جہاں بیٹھ گئے، بیٹھ گئے۔ اچانک لیٹروں کے سردار پر نظر پڑی۔ . . . جو لباسِ فاخرہ پہنے ایک سجے سجائے گھوڑے پر سوار بڑی شان سے چلا جا رہا تھا . . . . خدا مجھے معاف کرے۔ میرے نفس نے شرارت کی، اور میں نے اُس کی راہ میں حائل ہو کر للکارا کہ او بدبخت! پھر دُنیائے دنی کی آلائشوں میں لتھڑ گیا۔

وہ جھٹ گھوڑے سے کودا اور میرے قدم لے کر بولا "اے مرشد! "یہ سب آپ کے عطیے کی برکت ہے۔" اور پھر اس ناہنجار نے اپنی داستان سنائی جس کے مطابق اس کے نکاح میں آنے والی کنیز دراصل ترکستان کے ایک معزز گھرانے سے تعلق رکھتی تھی اور اکبر آباد پہنچ کر اسے معلوم ہوا کہ اس کا ایک ماموں دربارِ اکبری میں پنج ہزاری کا منصب رکھتا ہے بس پھر کیا تھا وہ دونوں اس کے پاس جا پہنچے اور زوجہ کے ماموں نے اس لیٹرے

کو بھی پنج صدی کا عہدہ دلوادیا۔

میں اُس کے مقدر پر عش عش کر ہی رہا تھا کہ اُس نے کہا۔ آپ یہاں اس حال میں کیسے؟ وہ ملک التجار کہاں ہے؟ میں ہنس پڑا اور وہ حیرت سے میری شکل تکنے لگا۔ آخر میں نے سنجیدگی اختیار کر کے پھر جھوٹ بولا، خدا مجھے معاف کرے پیٹ بڑا ظالم ہے۔ اے شخص کیسا ملک التجار اور کہاں کا ملک التجار؟ میرا اور اُس کا ساتھ تو محض تیرے لئے ہوا تھا۔ تیرا کام بن جانے کے بعد ہماری راہیں الگ الگ ہوگئیں۔

اُس نے کہا "یا حضرت! تو پھر میرے غریب خانے پر قدم رنجہ فرمایئے اور اپنی خدمت کا موقع دیجئے! میں تو آپ کے دستِ حق پرست پر بیعت کر ہی چکا ہوں۔ میری زوجہ کو بھی اس سعادت سے محروم نہ رکھئے۔ وہ بھی آپ کی بڑی عقیدت مند ہے۔"

میں پھر ہنس پڑا۔ اور آسمان کی طرف دیکھ کر بولا "تو خوب واقف ہے کہ تیرا یہ گندہ بندہ کتنے پانی میں ہے، اور مجھے اس پنج صدی سردار کی بات ماننی ہی پڑے گی کیونکہ ابھی اسے ہفت ہزاری کے منصب پر پہنچنا ہے۔"

میری بات سُن کر وہ اچھل پڑا لگا گڑگڑانے کہ یا حضرت کہ آپ میرے گھوڑے پر سوار ہو جایئے۔ میں لگام پکڑ کر پیدل اپنی حویلی تک جاؤں گا۔ میں نے کہا ایسی حماقت کی بات نہ کر۔ خلقت کا اژدحام میرے پیچھے ہوگا۔ . . . تو اپنی حیثیت دیکھ اور میری شکستہ حالی دیکھ۔ اگر خلقت میرے راز سے آگاہ ہوگئی تو میں یادِ خدا کے لئے کہاں سے وقت نکالوں گا؟"

اس نے میری اس بات سے اتفاق کیا اور گھوڑے کو خادم کے حوالے

کر کے میرا ہاتھ پکڑے ہوئے پیدل ہی چل پڑا تھا۔ اس پر بھی خلق خدا کی نظریں ہم پر پڑ رہی تھیں۔ وہ رئیس ابن رئیس لگ رہا تھا اور میرے جسم پر چیتھڑے جھول رہے تھے۔ میں نے اُڑتی پڑتی چہ میگوئیاں بھی سنیں کوئی کسی سے کہہ رہا تھا "شاید سردار نے اس چور کو رنگے ہاتھوں پکڑا ہے۔"

دل ہی دل میں کُڑھتا۔ اس کے ساتھ چلتا رہا۔ خُدا کی شان یہ لُٹیرا سردار ٹھہرا۔ اور میں اپنی قوتِ بازو سے کما کر حلال کی کھانے والا چور کہلایا۔ ظاہر پر قیاس کرنے والوں سے خُدا ہی سمجھے۔ بس اُسی وقت سچ مچ دُنیا سے جی اُچاٹ ہو گیا۔ . . اُچاٹ ہی رہتا، اگر میں اس لیٹرے کی زوجہ کو قریب سے نہ دیکھ لیتا۔ آنکھوں میں بجلیاں سی کوندگئیں۔ چاند کا ٹکڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر خوشی کے مارے اُچھل پڑی اور میرے قدم لئے۔

قطب الدین قلی نے کہ نام اُس لیٹرے کا یہی تھا۔ اپنی زوجہ کو میرے ملنے کی داستان سُنائی اور یہ خوشخبری دی کہ پیر و مرشد نے صرف شادی ہی نہیں کرائی تھی بلکہ مجھے ہفت ہزاری کے منصب تک پہنچوانا بھی قدرت نے انہی کے ذمے ڈالا ہے۔ وہ نیک بخت خوشی سے مزید اچھل پڑی اور میری وہ آؤ بھگت کی کہ جاؤ بھگت کے تصور ہی سے میرا دم اُلٹنے لگا۔

مجھے غُسل دلوایا گیا۔ صاف سُتھرا جوڑا پہننے کو ملا۔ غرضیکہ دن اچھے گُزرنے لگے اور آس پاس یہ خبر مشہور ہوگئی کہ میں جلالی نہیں بلکہ جمالی بزرگ ہوں کیونکہ لوگوں کو میری باتیں سن کر ہنسی آتی ہے۔

کچھ عجیب معاملہ تھا کہ جو کچھ میری زبان سے نکلتا، وہ ہو جاتا۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ شیطان الرجیم مجھے زیادہ گہری دلدل میں پھنسانے کے لئے میرا ممد و معاون ہو گیا تھا اور اللہ کی طرف سے رسّی دراز ہو رہی تھی۔ ہر چند

چاہا تھا کہ میری زندگی قطب الدین قلی کی حویلی تک محدود رہے لیکن کسی طرح ممکن نہ ہوا۔ نوکروں چاکروں نے بات آگے تک بڑھا دی۔

حویلی سے تھوڑے فاصلے پر ایک دوسری حویلی تھی جس میں ایک بوڑھا رئیس رہتا تھا۔ اس کی سب سے چھوٹی یعنی چوتھی زوجہ پر کوئی جن آتا تھا اور جن بھی عموماً اسی رات کو آتا تھا جس رات کو اس کی باری ہوتی تھی۔ یعنی رئیس کو اُس کے ساتھ رہنا ہوتا تھا۔ صدہا عاملوں سے رجوع لایا جا چکا تھا لیکن کوئی بھی اُس جن کو بھگا دینے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔

ایک شب قطب الدین قلی میرے آگے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا کہ میں بھی اس رئیس کی زوجہ کو دیکھ لوں۔ میں نے کہا میاں! میں گنڈے تعویذ والا آدمی نہیں ہوں۔ کہنے لگا کہ وہ بوڑھا رئیس، بادشاہ کا مقرب ہے۔ اگر میرے توسط سے اس کا کام بن گیا تو میں اپنے میاں سسر کا احسان لئے بغیر بھی آگے بڑھ سکوں گا۔

اب میں اُسے کیا بتاتا کہ جن آتشی مخلوق ہے اور آدمی خاکی تخلیق۔ دونوں میں کوئی جوڑ نہیں، جس طرح آدمی کسی بکری پر عاشق نہیں ہوسکتا اسطرح کوئی جن کسی عورت کی طرف مائل نہیں ہوسکتا۔ پھر بھی میں نے سوچا، چلوں، دیکھوں، کس دل گردے کی عورت ہے اور کس ڈھنگ سے یہ ڈھونگ رچایا ہے؟

بعض بوڑھے آدمیوں کی جوان بیویوں پر اختناق الرحم کے دورے پڑتے ہیں۔ اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ آسیب یا جن ہے اور بعض چالاک عورتیں اہل خاندان کو مرعوب کرنے کے لئے محض یہ ڈھونگ رچاتی ہیں۔ بہر حال مجھے اس رئیس کی حویلی تک جانا پڑا۔

وہاں عجیب سا نقشہ نظر آیا۔ ایک مہ پارہ کی عمر زیادہ سے زیادہ بیس

بائیس سال رہی ہوگی۔ ایک تخت پر بیٹھی جھوم رہی تھی۔ بال کھلے ہوئے تھے۔ پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں تھیں اور چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ ایسی خوبصورت عورت آج تک اس عاجز کی نظر سے نہیں گزری تھی اس لئے ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھتا رہا۔

قطب الدین قلی نے آہستہ سے پوچھا "کیا خیال ہے؟" میں نے کہا "زبردست ہے۔ جلدی نہیں اترے گا۔۔۔ وقت لگے گا۔" رئیس بھی قریب کھڑا ہوا پہلے اس نے مجھے اُوپر سے نیچے تک دیکھا اور پھر نیچے سے اوپر تک دیکھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ میں نے ڈپٹ کر کہا "اگر عمر نامعتبر تھی تو تم نے درخواست ہی کیوں کی تھی۔؟" وہ سہم گیا جیسے میں نے اس کے دل کا چور پکڑ لیا ہو گڑگڑانے لگا "یا حضرت! اس وسوسے پر مجھے معاف فرمایئے! آپ تو دلوں کا حال جان لیتے ہیں۔ میری نیت میں کھوٹ نہیں تھا۔"

میں نے ناگواری سے منہ پھیر لیا۔ اتنے میں اس زنِ حسینہ نے اپنی لانبی لانبی پلکیں اُوپر اٹھائیں۔ کیا نشیلی آنکھیں تھیں، مجھے اپنی رگوں میں خون کی جگہ کوئی نشیلا سیال دوڑتا ہوا معلوم ہونے لگا۔ قریب تھا کہ چکرا کر گروں اور بے ہوش ہو جاؤں، اس پری رو نے دہن کھولا اور یوں گویا ہوئی "اگر میرا چوتھے دن آنا بھی گراں گزرتا ہے تو اب میں ضد میں روز آؤں گا۔"

میں نے ہنس کر کہا "ضرور آؤ۔۔۔ مگر اپنا نام تو بتا دو۔" اس پر وہ بولی "نام تو ہرگز نہیں بتاؤں گی ورنہ توڑ کر لو گے۔" میں نے ڈپٹ کر کہا۔ "توڑ تو بہر صورت ہوگا۔ میں نے تو ازراہِ انسانیت نام پوچھا تھا کہ تمہاری لوحِ مزار پر لکھوا دوں گا۔ تو اگر جن ہے تو مجھ سے واقف ہوگا۔ شہنشاہِ جنات بھی مجھے جھک کر سلام کرتا ہے۔"

عورت کے جسم میں رعشہ پڑ گیا اور میں نے حاضرین سے کہا۔ تم سب

فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ میں اسے ابھی دیکھ لیتا ہوں۔"

بوڑھے رئیس نے کسی قدر ہچکچاہٹ ظاہر کی تھی۔ قطب الدین قلی اس کا بازو پکڑ کر اُسے وہاں سے ہٹا لے گیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اُسے کم از کم اتنی دُور ضرور لے جائے گا کہ ہماری آوازیں اس کے کان میں نہ پڑ سکیں۔

میں نے تخت کے قریب پہنچ کر آہستہ سے کہا۔" اب سیدھی ہو جائیں تیرے دکھ سے واقف ہوں۔" اس نے سر اٹھائے بغیر پوچھا۔"تم کون ہو؟" میں نے کہا۔" بس ایک بندۂ خدا، لیکن اچھی طرح جانتا ہوں کہ اسے اپنے سے دُور رکھنے کے لئے یہ سب کچھ کرتی ہے۔"

وہ رونے لگی۔ میں نے کہا۔ کب تک یہ ڈھونگ چلے گا۔ تقدیر پر شاکر ہو کر رہنے کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں۔ بس وہ روتی رہی کچھ بولی نہیں۔ میں نے کہا بات زیادہ نہ بڑھا۔ ورنہ کوئی ناسمجھ آ گیا تو تیرا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ میں نے تیرے شوہر پر یہی ظاہر کیا ہے کہ جن ہی ہے، وہ بڑی مشکل سے گویا ہوتی۔" میں تمہاری بہت شکر گزار ہوں لیکن اس شخص کے قرب سے موت ہی بھلی لگتی ہے۔" میں نے پوچھا" کیا چھٹکارا چاہتی ہے؟" اس نے کہا۔ ہاں میں یہی چاہتی ہوں۔ میں نے اُس سے وعدہ کیا کہ کوئی تدبیر کر دوں گا۔

مَیں نے دوسرے کمرے میں جا کر اُس کے شوہر کو الگ بلایا۔ اور اُسے قہر آلود نظروں سے گھورتا ہوا بولا۔" کیا چوتھی ضروری تھی؟" اس نے کہا کہ اس کی خاندانی روایات کے مطابق چار سے کم زوجائیں رکھنے والا کم رُتبے والا سمجھا جاتا ہے۔ میں نے کہا۔" فی الحال تو وہ چلا گیا ہے لیکن تم کم از کم ایک ماہ تک اس سے دور رہنا ورنہ پچھتاؤ گے۔ اُس کا قرب تمہاری موت کا باعث بن جائے گا۔ ایسا مفسد جن آج تک میں نے نہیں دیکھا۔ جاتے جاتے اُس کے وجود کو زہر میں ڈبو گیا ہے۔"

بوڑھے رئیس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ مَیں نے مزید کہا۔" اُس سے اتنے دُور رہو کہ اُس کی سانس بھی تم تک نہ پہنچ سکے۔" وہ بہت پریشان نظر آنے لگا تھا۔ میں نے لوہا گرم دیکھ کر آخری ضرب لگائی یعنی اسے چھوڑ دینے پر آمادہ کرنے لگا۔ میں نے کہا" تمہیں کیا کمی ہو سکتی ہے؟ اسے طلاق دے کر اور کسی سے کر لو۔" اس نے کہا" اب یہی کرنا پڑے گا۔ اُسی سے کر لوں گا جسے پہلی زوجہ کے فوت ہو جانے تک ملتوی کر رکھا ہے۔ پہلی زوجہ دو چار ہی دنوں کی مہمان ہے۔"

بہرحال یہ بات طے پا گئی تھی کہ وہ جلد از جلد چوتھی بیوی سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرے گا۔ پھر اس نے سو اشرفیاں نذر گزاریں۔ میں نے ان پر ہاتھ رکھ کر واپس کر دیا اور کہا۔" انہیں محتاجوں میں تقسیم کرا دو۔"

اپنا قطب الدین قلی میرے اس انداز پر کھل اٹھا تھا اور بڑے فخر سے میری طرف دیکھ کر بوڑھے رئیس سے کہا تھا" میرے پیر و مُرشد سونے کے پہاڑ کو بھی ٹھوکر مار دیں۔"

●

قطب الدین قلی اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ ثناء اللہ بارچی کی طرف مطمئن ہو جاتا حتی الامکان کوشش کرتا تھا کہ اس کا سامنا نہ ہونے پائے۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگا" پیر و مرشد! موذی کے لئے حکم ہے کہ ایذا پہنچنے سے قبل ہی اُسے ٹھکانے لگا دیا جائے۔" میں نے کہا کہ" سنا تو یہی ہے۔ حکم نہ ہو تب بھی عقل کا تقاضا یہی ہے۔ کیا تم نے حویلی میں کوئی سانپ دیکھ پایا ہے؟" وہ کسی قدر تذبذب کے ساتھ بولا۔" یہ بات نہیں ہے پیر و مرشد! میرا اشارہ ثناء اللہ بارچی کی طرف ہے۔

وہ ابھی تک اکبر آباد میں مقیم ہے اور دربار میں حاضری دیتا رہتا ہے۔ مجھے بڑی دشواری
ہوتی ہے چھپنا پڑتا ہے۔" میں نے کہا "کیوں فکر کرتے ہو۔ تمہارے لئے اب
کوئی خطرہ نہیں ہے۔" لیکن اس نے کہا "میں بہر حال ایک لٹیرا تھا۔ میرے
تائب ہو جانے سے قانون تو مطمئن نہیں ہو سکتا۔ میرے جرائم کی سزا یقینی ہو جاتے
گی اگر اس نے نشاندہی کر دی بے ایمان آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اعلانیہ کنیزوں کو
آزاد کیا تھا اور وہ ہم لوگوں کے نکاح میں آئی تھیں لیکن اب لوگوں سے کہتا پھر
رہا ہے کہ میری سولہ عدد ماہ رخ کنیزوں کو لیٹرے پکڑ لے گئے ہیں۔" میں نے
کہا "اگر ایسی بات ہے تو تم واقعی خطرے میں ہو۔" مجھ سے یہ بات سن کر اس
نے سکوت کیا اور کچھ دیر مبعد گویا ہوا "اس لئے ایک گناہ اور سہی۔"
میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ ثناء اللہ پارچی کو قتل کر کے قصہ ہی ختم کر دینا چاہتا
تھا۔ خوفِ خدا سے میری زبان نہ کھل سکی۔ میں خواہ مخواہ اس کی ہاں میں ہاں ملا کر
تھوڑا سا عذاب اپنے سر بھی کیوں لیتا۔ وہ غور سے میرا چہرہ تکتا رہا لیکن جب
میری زبان سے کچھ نہ نکلا تو بے چینی سے بولا "یا حضرت! میں نے اجازت
طلب کی تھی۔"

میں نے کہا "اگر تم اسے موذی سمجھتے ہو تو حکم پہلے ہی سے موجود ہے۔
میری اجازت ضروری نہیں۔"
اس نے لجاجت سے کہا "پھر بھی میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ میرا یہ
فعل آپ کے تئیں ناپسندیدہ تو نہ ہوگا؟" میں کیا جواب دیتا صرف اتنا
ہی کہا "میں تمہیں مضطرب دیکھنا پسند نہیں کروں گا۔"
اس نے کہا "بات اب بھی صاف نہیں ہوئی پیرو مرشد!"
میں نے کہا "حضرت امیر تیمور گورگان نے اپنی تزک میں تحریر فرمایا

ہے کہ کوئی کام کرنے سے پہلے یہ دیکھ لو کہ اس کے کرنے میں کتنا خطرہ ہے اور نہ
کرنے میں کتنا خطرہ ہے اگر نہ کرنے میں دو خطرے ہیں اور اس کے کرنے میں ایک
خطرہ ہو تو اسے ضرور کر گزرنا چاہیئے۔"
وہ بے بسی سے بولا "بات میرے پلے نہیں پڑی۔"
میں نے کہا "اگر ثناء اللہ پارچی کو قتل کر دو گے تو جہنم کے سزاوار ہو گے یہ
ہوا ایک خطرہ۔ اگر قتل نہیں کرتے تو زوجہ سے بھی ہاتھ دھو بیٹھو گے اور سزا
بھی پاؤ گے۔ یہ ہوئے بیک وقت دو خطرے۔"
اس نے لپک کر پوچھا "تو میں اسے قتل کر دوں! آپ اجازت دیتے
ہیں؟"
"میں بے چارہ کس شمار و قطار میں ہوں۔" میں نے کہا "تم ایسا کر کے
حضرت امیر تیمور گورگان کے مشورے پر عمل کرو گے۔"
وہ خوش خوش چلا گیا اور میں نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا۔
"پروردگار! اب یہ جانے اور امیر تیمور گورگان۔ میں نے بہت چاہا تھا کہ
خونِ ناحق اپنی گردن پہ نہ لے۔"
ہر چند کہ ثناء اللہ پارچی میرے لئے بھی فتنہ بن سکتا تھا لیکن اس کے
لئے میں اس کی موت کا خواہاں ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ زیادہ پریشانی لاحق ہوتی
تو اکبر آباد سے کسی اور طرف رخ کرتا۔ قطب الدین قلی بے جگر آدمی تھا۔
جو کچھ سوچتا کر گزرتا۔
تین دن کے اندر اندر اطلاع مل گئی کہ ثناء اللہ پارچی ایک حادثے کا شکار
ہو کر مر گیا۔ کسی شرابی نے اس پر اپنا گھوڑا چڑھا دیا تھا۔
میں نے قطب الدین قلی سے کہا "چلو اچھا ہوا۔ تم ایک گناہ سے بچے

اور مقصد بھی حاصل ہوگیا ۔" ہنس کر خوش ہوگیا۔ میں نے کہا " شاید وہ شرابی
قید کر دیا گیا ہے ۔" کہنے لگا " اُسے بھی قید آب وگل روشگاری ہوئی ۔" میں
نے اُسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا " کیا سُولی پر چڑھا دیا گیا ؟"
" نہیں خود بخود مر گیا ۔" وہ بڑی سادگی سے بولا اور کچھ دیر خاموش رہ کر
کہنے لگا " آپ کو وہ زنِ حسینہ تو یاد ہوگی جس پر جن آتا تھا ۔" میں اعتراف کیا۔
تب اس نے بتایا کہ اُسے طلاق بھی ہوگئی، لیکن وہ میری اس قدر گرویدہ ہوگئی
ہے کہ عدت گزارنے کے بعد سیدھی میرے پاس چلی آئے گی۔ یہ سُن کر میرے
دیوتا کوچ کر گئے اور میں نے بدحواس ہوکر پوچھا " میرے پاس کیوں چلی آئے
گی ؟" کہنے لگا " بقیہ زندگی آپ کی خدمت میں گزارنا چاہتی ہے ۔" میں نے
کانوں پر ہاتھ رکھے اور جلدی سے بولا " میں عورتوں کو مرید نہیں کرتا ۔" کیونکہ
شاید مجھے بھی زن مُرید بننا پڑے کیونکہ والد بزرگوار ہی کا خون تو گردش کر رہا
تھا، میری رگوں میں بھی، لیکن یہ نکتہ اس سے بیان نہیں کیا ۔ صرف سوچ
کر رہ گیا۔
اُس نے کہا " اچھا تو پھر دُعا فرمایئے کہ وہ مجھ سے نکاح کر لینے پر
آمادہ ہو جائے ۔"
یہ سُن کر میں سناٹے میں آگیا۔ ابھی پہلی ہی شادی کو کتنے دن ہوئے
تھے ۔ میں نے کہا " ایسی بھی کیا جلدی ہے ۔ کچھ دن تو اور گزارنے دو ۔"
تڑپ سے بولا " اس طرح آپ کی خدمت میں حاضری کا اسے موقع
مل جایا کرے گا ۔"
" قطب الدین قلی " میں نے طیش میں آکر کہا " اپنے نفس کا تیر میری
کمان سے چلانے کی کوشش نہ کرو۔ میں تمہیں دوسری شادی نہیں کرنے

دوں گا ۔" وہ سہم گیا اور اس طرح میری شکل تکنے لگا جیسے میں نے کوئی بہت بڑی
بات کہہ دی ہو۔ تھوڑی دیر بعد ٹھنڈی سانس لے کر بولا " آپ کی مرضی لیکن
میں خود کو دربار میں بہت ہلکا ہلکا سا محسوس کرتا ہوں جبکہ دربان تک کی
دو دو، تین تین زر جائیں ہیں اور میں پنجصدی ہوکر بھی صرف ایک ہی رکھتا ہوں ۔"
میں نے سوچا اگر اس قسم کا بھوت سوار ہوا ہے تو آسانی سے نہیں اترے گا۔
لہٰذا دوسرے زاویے سے حملہ کیا۔ میں نے کہا " اچھا تو پھر زندگی بھر پنجصدی
ہی پر قیام کئے رہنا ۔"
چونک کر مجھے ازسرِ نو دیکھنا شروع کیا اور ہڑبڑا کر بولا " میں نہیں سمجھا
پیر و مرشد ۔"
میں نے کہا " ایک سے زیادہ تیرے حق میں بہتر نہیں ۔ پنج ہزاری تک
پہنچنے سے قبل اس کا خیال دل میں نہ لانا۔ تم نہیں جانتے کہ دوسری بیوی تیرے
لئے سعد ہوگی یا نحس ۔ کیا تُو نے نہیں سُنا۔ عورت، گھوڑا اور زمین . . .
تینوں کے معاملے میں محتاط رہنا چاہیئے ۔"
اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں ۔ میں نے لوہے کو تپتے دیکھا تو فوراً
ہی دوسری ضرب لگائی " اور پھر وہ عورت ایک جن کے زیر اثر رہ چکی ہے۔
جن کو میں نے ہی بھگایا تھا اور تمہارے توسط سے اس تک پہنچا تھا۔ لہٰذا وہ شر
کا کوئی پہلو نہیں چھوڑے گا ۔" پھر ایسا لگا جیسے قطب قلی یک بیک ہوش میں
آگیا ہو۔ سر ہلا کر بولا " اس کا تو مجھے دھیان ہی نہیں رہا تھا پیر و مرشد . . .
اگر آپ کی رہنمائی حاصل نہ ہو تو شاید میں غرق ہی ہو جاؤں ۔ اللہ آپ کا
سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پہ قائم رکھے ۔"
میں نے اطمینان کا سانس لیا، ویسے حقیقت یہ تھی کہ مجھے بھلا اس سے کیا

سروکار ہو سکتا تھا کہ ایک کرتا ہے یا چار۔ میں تو صرف اپنی عاقبت کو ڈرتا تھا کہ وہ
خطرے میں پڑ جائے گی۔ دونوں اپنا اپنا دکھڑا مجھی سے روئیں گی اور میری سمجھ میں
نہ آئے گا کہ کس کے لئے کیا کروں۔ قطب قلی عورت کے معاملے میں نالائق آدمی
تھا۔ کبھی غلامی کرتا ہوا نظر آتا اور کبھی اس طرح آنکھیں پھیر لیتا، جیسے مروت کی رمق
بھی دل میں رکھتا ہو۔ اس کی اسی عادت کی بنا پر اس کی زوجہ کتنی بار مجھ سے پوچھ
چکی تھی۔ اُس سے کیا کہتا کہ وہ بھی انہی آدمیوں میں سے ہے جو حصول مقصد کے
تحت آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ بہرحال میں اُس کے سر پر سے دوسری زوجہ کا بھوت
اتارنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور وہ اسی توقع پر میری خدمت گزاری میں لگا ہوا تھا
کہ میری دعاؤں کے اثر سے دربار میں کوئی نمایاں حیثیت حاصل کر لے گا۔
عجیب واردات گزری تھی مجھ پر۔ نکلا تھا والد بزرگوار کی تلاش میں اور پڑ گیا

ان اُلجھیڑوں میں۔
اور اب کبھی کبھی یہ خیال بھی آتا ہے کہ کہیں میں نادانستگی میں ایام یتیمی
تو نہیں گزار رہا۔ کیا ضروری ہے کہ پدر بزرگوار زندہ ہی ہو، بہرحال گھر تو اسی
نیت سے چھوڑا تھا کہ اسے تلاش کر کے کچھ تھوڑی خدمت اس کی بھی
کر سکوں کہ عاقبت سنور جائے۔ اب آگے جو اللہ کو منظور ہو۔ دن گزرتے گئے
قطب قلی اور اس کی زوجہ دن رات میری خدمت گزاری میں لگے رہتے
تھے کہ اچانک ایک دن نسترن بانو آ ہی گئی۔ وہی نسترن بانو جو اپنے بوڑھے
شوہر سے طلاق لے کر اُسی کے مصارف پر عدت کے دن گزار رہی تھی۔ عدت
پوری ہوتے ہی اُس نے اِدھر کا رُخ کیا تھا۔ مجھے اپنے پیروں تلے زمین ہلتی
محسوس ہوئی۔ منعم حقیقی نے اُسے ایسا ہی جہاں سوز حسن عطا کیا تھا۔ کہنے لگی "اب
کہاں جاؤں، میرا تو اس دُنیا میں کوئی بھی نہیں۔"

میں نے کہا "تو عقد ثانی کیوں نہیں کر لیتی" کہنے لگی "دنیا سے جی اچاٹ
ہو گیا ہے۔ بقیہ زندگی یادِ خدا میں گزار دینا چاہتی ہوں۔ اگر اس حویلی میں
سر چھپانے کو جگہ مل جائے تو"
میں نے قطب قلی کی زوجہ کی طرف دیکھا۔ اس نے ناک سکوڑ کر انکار
کے لئے سر ہلا دیا۔ میں نے نسترن بانو سے کہا "اگر میں خود یہاں مہمان نہ ہوتا
تو ضرور تیری درخواست پر غور کرتا لیکن چونکہ . . ."
قطب قلی کی زوجہ نے مجھے اپنی بات پوری نہ کرنے دی اور خود نسترن بانو
سے بولی "میرا میاں اچھا آدمی نہیں ہے۔ جابر، قاہر، ہٹ دھرم ہے اور
کیا کیا بتاؤں . . . بس سمجھ جاؤ۔ تم یہاں محفوظ نہ رہ سکو گی" نسترن بانو تڑپ کے
بولی۔ "جس کا محافظ اللہ ہو اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا" پھر میری طرف دیکھنے
لگی۔ میں بھلا کیا کہتا لیکن اس کے دیکھنے کا انداز ایسا تھا جیسے کسی قسم کی دھمکی
دے رہی ہو اور اچانک مجھے یاد آگیا کہ اس پر حقیقتاً کسی جن کا سایہ نہیں تھا۔
بنتی رہی تھی، لیکن میں نے اُسے جن ہی کے حوالے سے طلاق دلوائی تھی، وہ اسی
انداز سے مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے قطب قلی کی زوجہ کو اشارہ کیا کہ وہ وہاں
سے چلی جائے۔ وہ تو میرے احکامات کی پابندی بے چوں و چرا کرتی رہی
تھی، چپ چاپ چلی گئی اور نسترن بانو مجھے گھورتی ہوئی آہستہ سے بولی "بھانڈا
پھوڑ دوں گی"
میں نے اسے اس طرح دیکھنے کی کوشش کی کہ وہ مرعوب ہو جائے، لیکن
اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اپنا یہی جملہ بار بار دُہراتی رہی، پھر میں ایک دم طیش
میں آکر بولا "یہ کیا بکواس ہے" وہ ہنس پڑی اور آنکھیں چمکا کر بولی "نہ تم
ولیِ کامل ہو اور نہ مجھ پر کوئی جن آتا ہے۔ ولیِ کامل ہوتے تو جھوٹ بول کر

میرے سابقہ شوہر کو یقین نہ دلاتے کہ مجھ پر جن کا سایہ ہے اور اسے مجھ کو طلاق دے دینے پر ہرگز نہ اکساتے اگر میں لوگوں کو بتا دوں تو کیا حشر ہو تمہارا؟"

میرے سارے جسم سے پسینہ چھوٹ پڑا۔ اور میں حضرت امیر تیمور گورگان کی تزک میں کوئی راستہ گلو خلاصی کا تلاش کرنے لگا لیکن ایسے میں کیا یاد آتا، سارا لکھا پڑھا جیسے ذہن سے نکل بھاگا ہو۔ بالآخر کھوکھلی آواز میں پوچھا کہ آخر وہ چاہتی کیا ہے۔ بڑی اُداسی سے بولی "بس اپنے قدموں میں پڑی رہنے دو" میں نے کہا "بھلا یہ کس طرح ممکن ہے۔۔۔؟ قطب قلی کی زوجہ، تم جیسی چندے آفتاب و چندے ماہتاب عورت کو کس طرح اپنی حویلی میں رکھ سکے گی جب کہ قطب قلی خان دل پھینک قسم کا آدمی ہے" جھٹ سے بولی "تم سے تو ڈرتا ہے نا۔ تم ویسا ہی کوئی جھوٹ تراشو جیسا میرے سلسلے میں پہلے تراشا تھا۔ اور میرے میاں کو طلاق ہی دیتے بن پڑی" سر چکرا گیا۔ سچ کہا ہے، بزرگوں نے ایک جھوٹ کو سنبھالنے کے لئے سینکڑوں جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ اس لئے ذرا سا بھی جھوٹ نہ بولو۔ میں نے دل ہی دل میں کان پڑے، لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔ تیر نکل چکا تھا کمان سے، اور کمان سے نکلے ہوئے تیر کو امیر تیمور گورگان بھی واپس نہ لا سکتے تھے، لہٰذا ان کی تزک کو اب کھنگالنا ہی فضول تھا۔ تن بہ تقدیر ہو کر ٹھنڈی سانس لی اور بولا "جو کچھ تو کہہ رہی ہے وہی ہوگا۔ میں پہلے ہی سے جانتا تھا کہ اس مرحلے سے ضرور گزرنا پڑے گا" بڑی سنجیدگی سے سر ہلا کر بولی۔ "تم ایسے ہی روشن ضمیر ہو یا پیر و مرشد"

اُس کا یہ ٹھٹھول اتنا ناگوار گزرا کہ گردن ہی مروڑ دینے کو دل چاہنے لگا۔ صبر پر قرار کرنا پڑا تھا۔ پھر تقدیر کی اس ستم ظریفی پر ہنسی آنے لگی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس طرح میرے ہی گلے پڑے گی، ورنہ ہرگز اس کی گلو خلاصی اس

بوڑھے رئیس سے نہ کراتا۔

قطب قلی، دربار سے واپس آیا تو سیدھا میرے ہی پاس چلا آیا۔ شاید اُسے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ آئی ہوئی ہے، کہنے لگا "یا حضرت! اگر وہ آپ کی اتنی ہی گرویدہ ہے تو پڑی رہنے دیجئے قدموں میں، کیا حرج ہے" میں نے کہا۔ "اب تو میں بھی مجبور ہو گیا ہوں اس بارے میں" وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگا۔

میں نے کہا "بحالتِ قیلولہ مجھے اپنے پیر و مُرشد کا دیدار ہوا۔ وہ بہت طیش میں تھے۔ مجھ سے فرمایا۔ کیا تو اتنا ہی ناہنجار ہے کہ ایک غیرت مند کو ہمارے سلسلے میں داخل ہونے سے روک دے۔ اس عورت کو مرید کر اور اپنے پاس ہی پڑی رہنے دے" وہ بیحد خوش ہو کر بولا "میں نے تو پہلے ہی عرض کیا تھا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کل بحالتِ قیلولہ آپ کے پیر و مُرشد کچھ میرے حق میں بھی فرما دیں"

اس کی اس ڈھٹائی پر سخت طیش آیا لیکن ظاہر نہ ہونے دیا۔ صرف اتنا ہی کہہ کر رہ گیا "دیکھا رہ، کیا لکھا ہے تیری تقدیر میں" اس نے بڑے خلوص سے کہا "اچھا ہی لکھا ہوگا۔ تبھی تو آپ کے پیر و مرشد کو خود تکلیف کرنی پڑی ہے۔ آپ نے تو سرے ہی سے میری تجویز رد فرما دی تھی" دل چاہا کہ قطب قلی کے منہ پر تھپڑ رسید کر دوں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ اس طرح میرا اجمال بزرگ ہونا مشکوک ہو جائے گا اور خلقتِ خدا مجھ سے دور بھاگنے لگے گی، جو میں قطعی نہیں چاہتا تھا۔

پھر ہوا یہ کہ نسترن بانو دن رات میرے سر پر سوار رہنے لگی۔ ایسے ایسے گُر بتاتی کہ عقل دنگ رہ جاتی۔ میں سوچتا کہ اگر کچھ دن اور اس کا ساتھ رہا تو

کہیں سچ مچ وَلی کامل نہ بن جاؤں۔ کہتی ہے کہ میں نے کس قدر بے وقوفی کے ساتھ
دھندا شروع کیا ہے۔ تھوڑا سا ڈبنگ ہو جاؤں تو دربار تک میری رسائی ہو
سکتی ہے۔ میں کہتا بس! مجھے معاف رکھ، جہاں پڑا ہوں وہیں چین سے پڑا
رہنے دے۔ ایک دن بولی "تمہاری ساکھ کو نقصان پہنچ جائے گا ورنہ میں تو یہ
کہتی ہوں کہ ہم دونوں رشتۂ مناکحت میں کیوں نہ منسلک ہو جائیں۔" میں نے کہا۔
میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔" بڑے پیار سے بولی "کیا میں تمہیں اچھی نہیں
لگتی۔" میں نے کہا "بے حد خطرناک لگتی ہو۔ کیا تم نے میرے بھی کان نہیں
کاٹ لئے۔" ہنس کر بولی "تم میں رکھا ہی کیا ہے کہ اتنی بڑی بات کہہ رہے ہو۔
کسی اتفاقی حادثے کے تحت ولی بن گئے ہو گے ورنہ تم میں اس کی صلاحیّت
نہیں پائی جاتی۔ کوئی بس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا ہو گا اور تم نے اس کی وہ غلط فہمی
رفع نہ کی ہوگی بس اس طرح بن بیٹھے ہو گے پیر و مُرشد۔ مجھ سے کوئی پوچھے
تو بتاؤں کتنے گھاگ ہو۔"

بہت زور کا غصّہ آیا لیکن خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ کئی دنوں سے
پتہ نہیں کیا ہوا تھا کہ میرے پاس آنے والے حاجت مندوں کی تعداد زیادہ ہو
گئی تھی۔ معلوم نہیں کہاں کہاں سے مستورات اپنے مسائل لے کر پہنچ رہی تھیں۔
وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ کیونکہ میں حتی الامکان کوشش کرتا کہ باہر کا کوئی آنے ہی نہ پائے۔
اور میں سکون کے ساتھ اس حویلی میں پڑا رہوں۔

ادھر قطب قلی کی زوجہ کا یہ حال تھا کہ مجھے کینہ توز نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔ ایک
دن تنہا ملی تو میں نے اُسے اپنے پاس بُلا لیا۔ نسترن بانو بھی اس وقت موجود
نہیں تھی۔ میں نے کہا "اے نیک بخت! تو مجھے اس طرح کیوں دیکھنے لگی ہے۔

اس عورت کو میں نے اپنے مُرشد کے حکم سے یہاں رہنے کی اجازت دی ہے۔
قطب قلی اُسے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ میں نے اسے جتا دیا ہے اور نسترن
بانو تو خود ہی اس سے دور دور رہتی ہے۔"

وہ پہلے تو کچھ نہ بولی۔ سر جھکائے بیٹھی رہی لیکن تھوڑی دیر بعد ٹھنڈی
سانس لے کر بولی "یہ بات نہیں ہے پیر و مُرشد! میرے مقدر میں جو کچھ لکھا
ہوگا ہو کر رہے گا۔ اسے کوئی نہیں ٹال سکتا۔ رنج اس بات کا ہے کہ اب ہم لوگ
جھُوٹے بن رہے ہیں۔ ہم نے تو سارے میں کہہ رکھا تھا کہ ہمارے پیر و مرشد
حاجت روائی تو کرتے ہیں لیکن کسی سے کچھ لیتے نہیں اگر کسی نے کچھ دینے کی کوشش
کی تو دوبارہ اس کی شکل نہیں دیکھتے۔" میں نے کہا "تو ٹھیک کہہ رہی ہے۔ میں
ان لوگوں سے ایسا ہی برتاؤ کرتا ہوں جو مجھے دنیائے دنی سے دل لگانے کی
ترغیب دیتے ہیں۔" تڑ سے بولی "بہت پہلے کی بات ہے۔ اب تو آپ کی پوٹلی
بھاری ہو رہی ہے۔" میں حیرت سے اُسے دیکھنے لگا۔

اُس نے کہا "میں غلط نہیں کہہ رہی پیر و مرشد! وہ نسترن بانو ہر حاجت مند
سے کچھ نہ کچھ ضرور وصول کر لیتی ہے بلکہ میں تو یہ کہتی ہوں کہ یہ بھیڑ بھاڑ اسی کی
کوششوں سے رہنے لگی ہے۔"

یہ سن کر میرے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے۔ کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا تصوّر
بھی نہیں کر سکتا تھا کہ نسترن بانو میری لاعلمی میں یہ سب کچھ کر رہی ہے۔ میں
نے بڑی مشکل سے قطب قلی خان کی زوجہ کو یقین دلایا کہ میں اس بات سے لاعلم
ہوں کہ نسترن بانو اور حاجت مندوں کے درمیان کیا معاملت ہوتی ہے۔ اُس
نے کہا "مجھے بھی یقین نہیں تھا لیکن وہ اس سے دل برداشتہ ہیں۔ بار بار کہتے
ہیں کہ پیر و مرشد نے یہ کیا شروع کر دیا۔"

میں نے کہا "بے فکر رہو میں نسترن بانو سے سمجھ لوں گا" بڑی مشکل میں ڈال دیا تھا اُس چالاک عورت نے۔ خوش قسمت تھا وہ بوڑھا رئیس جو اُس سے چھٹکارا پا گیا ورنہ خدا جانے اس کی کیا دُرگت بناتی۔ ارے اس وقت کیسی مظلوم نظر آتی تھی۔ کیسا روئی تھی۔ کیسا گڑگڑائی تھی کہ مجھے اس کی خاطر جھوٹ بولنا پڑا تھا اور اب اُسی جھوٹ کا ڈراوا دے کر میرے سینے پر سوار ہو گئی تھی۔

مَیں کیا کروں خداوندا۔ . . اب میری سمجھ میں آیا کہ دن کے وقت کئی کئی گھنٹے کہاں غائب رہتی ہے۔ کم بخت بستی بستی میری تشہیر کرتی پھرتی ہو گی۔ اسی لئے تو اجنبی حاجت مندوں کا تانتا بندھ گیا تھا۔ ہر ایک سے کچھ نہ کچھ وصول کرتی ہو گی۔ پتا نہیں کتنا بٹور چکی ہو گی اور میرے فرشتوں کو بھی اس کا علم نہیں، اب کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے ورنہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔

دوپہر کے کھانے کے وقت کہیں سے گھوم پھر کر واپس آئی تو میں نے اُسے اپنے پاس بلایا اور قہر آلود نظروں سے اُسے گھورنے لگا۔ لیکن وہ ہنس کر بولی "بس کرو، بالکل سوانگ بھرنے والے بہروپیئے لگتے ہو۔ تمہیں تو غصہ کرنا بھی نہیں آتا"

میں نے آپے سے باہر ہوتے ہوئے کہا "اپنی زبان کو لگام دے، ورنہ بہت بُرا حشر ہو گا"

سنجیدہ ہو کر بولی "آخر ہوا کیا۔ کیوں انگارے چبا رہے ہو" میں نے کہا "یہ تو حاجت مندوں سے رقمیں کیوں اینٹھنے لگی ہے" ہنس کر بولی "بس اتنی سی بات۔ سُنو! ہر بے وقوف پر اللہ پاک نے ایک عقلمند کو مسلط کر دیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ دنیا کبھی کی زیروزبر ہو گئی ہوتی۔ موقعے سے فائدہ نہ اٹھانے والا احمق ہوتا ہے، اسی لئے تو کہتی ہوں کہ تم کسی حادثے کے تحت یہ حیثیت حاصل کر بیٹھے ہو۔ تم میں اس کی صلاحیت ہرگز نہیں ہے۔ پس اللہ پاک نے تم پر رحم فرمایا اور مجھے ہدایت فرمائی کہ تمہاری سرپرستی کروں . . . سو کر رہی ہوں"

غصے کے مارے بہت بُری حالت ہو گئی۔ جسم کا ریشہ ریشہ کانپ رہا تھا بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن زبان گنگ ہو کر رہ گئی بس کھا جانے والی نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ اس کے باوجود بھی وہ بڑے پیار سے دیکھتی ہوئی بولی۔ "تم بہت بھولے ہو، مجھے تم پر ترس آتا ہے۔ اس لئے کچھ بھی ہو میں تمہارا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی، ورنہ قطب قلی کیا بُرا تھا۔ میرے ایک اشارے پر زوجۂ اوّل کو طلاق دے گا اور میرا ہی رہے گا" میں نے دل میں سوچا تو ایسی ہی ہے حرافہ۔ خیر تو بھی کیا یاد کرے گی۔ میں دیکھوں گا تجھے۔ پھر ایسا لگا جیسے اُس نے میرے دل کی بات جان لی ہو۔ مجھے گھورتی ہوئی بولی "تم مجھ سے اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکو گے۔ اگر اس کی کوشش کی تو جان سے بھی جاؤ گے"

میں نے زچ ہو کر کہا بس کر خدا کے لئے بس کر"

نرم پڑ کر بولی "میں جو کچھ بھی کر رہی ہوں تمہارے بھلے کو کر رہی ہوں۔ درباریوں کا کیا بھروسہ ہے، آج آسمان پہ چڑھے ہوتے ہیں، کل کسی بات پہ معتوب ہوتے اور تحت الثریٰ میں پہنچ گئے۔ پھر کہاں ٹھوکریں کھاتے پھروگے ابھی موقع ہے اتنا سرمایہ تو اکٹھا کر لو کہ کوئی بُرا وقت پڑے تو اپنی الگ ایک خانقاہ بنا کر بیٹھ جائیں"

میں سناٹے میں آ گیا۔ دل میں سوچا، ارے کم بخت! حشر میرا بُرا ہو گا اور مری تو جا رہی ہے۔ تجھے سے کیا مطلب تو آخر کون ہے؟ میری کیا لگتی ہے۔؟

میں نے جی کڑا کر کے کہا۔ "تو جو کچھ کہہ رہی ہے، وہ قطب قلی کو پسند نہیں آئے گا۔"

آنکھیں نکال کر بولی۔ "اچھا جی، وہ کون سا بڑا اچھا ہے اس کے بارے میں بھی سب کچھ معلوم کر چکی ہوں۔ اُس ترک سردار کی وجہ سے دربار میں رسائی ہوئی ہے۔ ورنہ اس سے پہلے وہ بھی جو کچھ کرتا تھا مجھے معلوم ہے۔"

میں سہم کر اس کی شکل تکنے لگا۔ وہ سر جھٹک کر بولی۔ "بڑے روشن ضمیر بنتے ہو۔ ذرا بتانا تو، دربار تک پہنچنے سے پہلے وہ کیا کرتا تھا۔۔۔؟"

میں نے کراہ کر کہا۔ "خدا ہی جانے۔" مجھے بہت غور سے دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔ "لٹیرا تھا اگر ابھی بھانڈا پھوڑ دوں تو گردن مار دی جائے۔"

ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ میرے جسم سے چھوٹنے لگا اور میں سوچے جا رہا تھا، کیا واقعی اس پر جن آتا ہے؟ اگر نہیں آتا تو اسے قطب قلی کے بارے میں کیسے معلوم ہوا۔ تو پھر یہ میرے بارے میں سب کچھ جانتی ہوگی۔ آخر کیا بلا ہے؟ وہ مجھے غور سے دیکھے جا رہی تھی۔ آخر مسکرا کر بولی۔ "مجال ہے اُس کی جو میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکے۔ دوسرے ہی دن اس کا لاشہ قتل گاہ میں تڑپ رہا ہوگا۔"

میرا بے اختیار یہی دل چاہ رہا تھا کہ چیخ مار کر بے ہوش ہو جاؤں، ارے اس ناگن کا سر میں نے اسی وقت کیوں نہیں کچل دیا تھا جب وہ بے لبسی سے میری مدد کی خواہاں تھی۔ "واہ نسترن بانو واہ۔۔۔ تو نے اچھا گل کھلایا ہے۔"

میں نے اس کی منت سماجت شروع کر دی کہ قطب قلی سے نہ الجھے "میں اُسے اور اُس کی زوجہ کو اس کی خبر نہ ہونے دوں گا۔"

اُس نے کہا۔ "وہ جانتی ہے کہ میں حاجت مندوں سے معاوضہ وصول

کر لیتی ہوں اور اُسی نے تم کو بھی بتایا ہے، ورنہ میں جانتی ہوں کہ تم بہروپیے ہو۔ حقیقتاً روشن ضمیر نہیں ہو۔"

میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "بس کر۔ جب تو اتنی چالاک ہے تو خود ہی یہ دھندا کیوں نہیں شروع کر دیتی۔ مجھے بیچ میں کیوں پیس رہی ہے۔" ہنس کر بولی۔ "میں عورت ہوں، اس لئے لوگوں کو مشکل سے یقین آئے گا۔ یہی بہتر ہے کہ تم پیر بنے رہو اور میں گاہک پھانستی پھروں۔ تم دیکھنا کہ میں کتنی جلدی تمہیں مالدار بناتی ہوں اور پھر ایسی خانقاہ تعمیر کراؤں گی کہ دنیا دنگ رہ جائے گی۔"

سوائے اس کے کہ اس کی ہاں میں ہاں ملاتا اور کیا کر سکتا تھا۔ رات کو سونے لیٹا تو سوچ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے، یہ عورت تو گردن کٹوا دے گی۔ کیوں نہ چپ چاپ کسی طرف نکل جاؤں اور اس میں جلدی ہی کرنی چاہیئے۔ اگر قطب قلی کے کان میں بھنک بھی پڑ گئی کہ مراد اس کی حیثیت سے واقف ہے تو پھر میری خیر نہیں۔ یہی سوچے گا کہ میں نے ہی اُسے بتایا ہوگا۔ یہ سوچ کر تو یہ بھی سوچے گا کہ کہیں میرے اور اس مراد کے درمیان ناجائز تعلق تو نہیں ہو گیا کیونکہ ایسی حالت میں عورتیں مردوں کے پیٹ کے اندر تک کی باتیں نکلوا لیتی ہیں۔ ڈر کے مارے میری گھگھی بندھ گئی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ جو کچھ بھی ہونا ہے، اسی رات کو ہو جائے۔ میں چپکے سے اٹھا کچھ تھوڑی بہت رقم میری گانٹھ میں بھی موجود تھی لیکن دربان کی آنکھ میں دھول جھونکنا مشکل ہوگا۔ رات بھر جاگ کر پہرہ دیتا تھا اور دن بھر سوتا تھا۔ دربانی کے فرائض اس کا بیٹا انجام دیتا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ اسے کس طرح جھکمہ دیا جائے اور میں بخیر و عافیت یہاں سے نکل جاؤں۔

. . . . .

میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ کسی نہ کسی طرح آج ہی رات کو حویلی سے نکل جاؤں گا۔ لیکن دھڑکا لگا ہوا تھا کہ چرخِ کج رفتار کہیں اور کوئی گل نہ کھلا دے۔ نسترن بانو قہر خداوندی بن کر مجھ پر نازل ہوئی تھی۔ بہرحال رات ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

سہ پہر کو قطب قلی آگیا۔ بہت خوش نظر آرہا تھا، میں سمجھا شاید عہدے میں مزید ترقی ہوئی ہے لیکن اس بدبخت نے تو کوئی اور ہی داستان چھیڑ دی۔ کہنے لگا کہ دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولے کو لیٹا تھا۔ آنکھ لگتے ہی آپ کے پیرو مرشد نظر آئے۔ سخت برہم تھے۔ میرا تو دل لرزنے لگا۔ آپ کا نام لے کر بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ یہ کلام سن کر میں سناٹے میں آگیا۔ کیسے پیرو مرشد، اور کہاں کے پیرو مرشد، جو اس ناہنجار کو بھی خواب میں نظر آگئے، لیکن بہرحال مجھے اپنے جھُوٹ کا بھرم رکھنا ہی تھا۔ تڑپ کر بولا۔ اے قطب قلی یہ کیا کہہ رہے ہو۔ کیا پیرومرشد کو میری کس بات پر غصّہ تھا؟

تھوتھنی نکال کر بولا "یہ تو میں نہیں جانتا، لیکن غصّہ آپ ہی پر تھا آخر آپ کا نام لے کر فرمایا "کیا وہ نہیں جانتا کہ جس کی دو بیویاں ہوتی ہیں اللہ پاک اس کے سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔"

مجھے چکّر آگیا۔ ۔ ۔ لیکن سکوت ہی پر قرار کیا۔ بھلا کہتا کیا۔ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ نسترن بانو کو تصرّف میں لانا چاہتا ہے۔ اور اب میرے "پیرو مرشد" کو بھی کھینچنا شروع کر دیا ہے، اس معاملے میں، میں نے انجان بنتے ہوئے کہا "لیکن اے خوش بخت میری تو ابھی تک ایک بیوی بھی نہیں ہے۔ یہ پیرومرشد دو بیویوں کی بات کہاں سے لے بیٹھے؟"

قطب قلی کا چہرہ کُملا گیا۔ شاید میری نادانی اور کم فہمی نے اسے گہرا صدمہ پہنچایا تھا۔ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "خُدا ہی جانے میں نے تو اس لئے عرض کیا تھا کہ یہ خواب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ شاید آپ ہی اس کی تعبیر و تفسیر کر سکیں۔"

میں نے کہا "پیرومرشد کی باتیں پیرومرشد ہی جانیں، بندہ عاجز والا چارے، ایک بیوی ہوتی تبھی تو دوسری کا سوال پیدا ہوتا۔ تم خود ہی سوچو بھلا سمجھ میں آنے والی بات ہے۔"

وہ دو تین ٹھنڈی سانسیں لے کر رخصت ہو گیا اور مجھے پھر نسترن بانو پر غصّہ آنے لگا۔ پتہ نہیں کتنوں کا دردِ سر بنے گی، یہ عورت بظاہر بھولی بھالی لگتی ہے جیسے بیچاری کو دُنیا کا علم ہی نہ ہو لیکن پِس کی گانٹھ، خدا اسے غارت کرے۔

تھوڑی دیر بعد دیکھا تو کھِل کھِل ہنستی چلی آرہی ہے۔ ہڈیاں سُلگ کر رہ گئیں۔ قریب پہنچی تو ہنسی روک کر بولی۔

"سنا ہے تمہارے پیرومرشد تم سے ناراض ہو گئے ہیں۔"

"کیا بک رہی ہو۔" میں نے اپنی آنکھوں کو قہر آلود بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"مجھ سے تمیز سے بات کیا کرو۔" اُس نے بھی آنکھیں نکالیں اور میرا دل کانپ کر رہ گیا تھا، لیکن ظاہری برافروختگی میں فرق نہ آنے دیا۔ اس نے ویسے ہی تیز لہجے میں کہا۔ "اسے سمجھا دو کہ میرے چکّر میں نہ پڑے ورنہ مارا جائے گا۔"

"آخر بات کیا ہے۔" میں نے انجان بن کر پوچھا۔ بُرا منہ بنا کر بولی "تمہارے پیرو مرشد اس کے خوابوں میں آنے لگے ہیں۔"

"ہاں ہاں۔" میں جلدی سے بولا۔ "کہہ رہا تھا، پتہ نہیں کیوں پیرو مرشد مجھ سے ناراض ہیں۔"

"کیا پیرو مرشد کا پیغام تم تک نہیں پہنچایا۔" ہنس کر بولی۔ میں نے بے بسی سے کہا۔ "پتہ نہیں پیرو مرشد کیا چاہتے ہیں۔ میری تو ابھی تک شادی بھی نہیں ہوئی۔"

غرا کر بولی۔ "کیا واقعی تم اتنے ہی گھامڑ ہو۔ ۔ ۔ ؟" اس طرزِ تخاطب پر مجھے بہت غصہ آیا۔ لیکن کیا کہتا۔ سچ ہی تو کہہ رہی تھی۔ گھامڑ نہ ہوتا تو اس طرح کیوں گلے پڑتی۔ مجھے خاموش دیکھ کر کہنے لگی۔ "وہ تم پر یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ تمہارے پیرو مرشد چاہتے ہیں کہ تم مجھے اُس سے نکاحِ ثانی پہ آمادہ کر دو۔"

"ارے توبہ توبہ۔" میں اپنا مُنہ پیٹتا ہوا بولا۔ "بھلا یہ کس طرح ممکن ہے۔ میں تمہیں کس طرح آمادہ کر سکتا ہوں۔"

وہ ہنس کر بولی۔ "جس طرح وہ خود تم سے مرعوب ہے اُسی طرح مجھے بھی سمجھتا ہے۔"

تو پھر اے نسترن بانو اس میں اس عاجز کا کیا قصور ہے۔" میں نے دل میں کہا اور اُس سے بولا۔ "اب جاؤ میرے مراقبے کا وقت ہے۔"

"سنو پیر جی، اب ہم دونوں یہاں نہیں رہیں گے۔ فائدہ بھی کیا اس ٹٹ پونجیے کے ساتھ رہنے کا۔" اُس نے مجھے کسی شکاری کُتیا کی طرح گھورتے ہوئے کہا۔

"میں فضول باتیں نہیں سننا چاہتا۔ تم کون ہوتی ہو میرے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے والی۔"

وہ دانت پیس کر بولی۔ "کیوں خراب و خوار ہونے کو جی چاہتا ہے۔ تم وہی کرو گے جو میں کہوں گی۔ شام کو ایک پنج ہزاری صولت خان تم سے ملنے آرہا ہے۔ وہ مجھے اور تم کو اپنی حویلی میں لے جائے گا۔ بس تم اپنے اوپر تھوڑی مجذوبیت طاری کر لو۔"

ایک بار پھر میرا سر چکرا گیا۔ کچھ کہنا چاہا لیکن زبان نے ساتھ نہ دیا۔ عجیب بے ہنگم سی آوازیں حلق سے نکل رہی تھیں۔ وہ مجھے تیز نظروں سے دیکھتی رہی۔ آخر بولی۔ "صولت خان کو دوبارہ کوئی زہر دینے کی کوشش کر چکا ہے۔"

"اچھا تو پھر۔" میں ہکلایا۔

"تم اس سلسلے میں اس کی رہنمائی کرو گے۔" اس نے کہا اور اپنا سر کھجانے لگی۔ گویا یہ آسان کام تھا۔ خود ہی مجھے بہروپیا بھی سمجھتی تھی اور یہ بھی کہہ رہی تھی کہ میں کسی روشن ضمیر کا کردار ادا کروں۔ صولت خان کو بتا دوں کہ اُسے زہر دینے کی کوشش کون کر رہا ہے۔ آخر میں زچ ہو کر بولا۔ "اے ظالم عورت ایک طرف تو مجھے ڈھونگ رچانے والا کہتی ہے اور دوسری طرف یہ کہ میں کسی روشن ضمیر کی طرح اندر دے مکاشفہ صولت خان کو اس کے دشمن کی شخصیت سے آگاہ کر دوں۔"

"اس کی فکر نہ کرو، میں تمہاری رہنمائی کروں گی۔"

"وہ کس طرح" میں نے تھوک نگل کر پوچھا، ہنس کر بولی۔ "بس صولت خان کو دیکھتے ہی اول فول بکنا شروع کر دینا"

میں نے دانت پیس کر کہا "اب شاید جوتے بھی کھلوائے گی"

"جوتے والا ہاتھ توڑ دوں گی" "تم مجھے سمجھتے کیا ہو؟"

"نہیں میرے بس سے باہر ہے"

"تب پھر جوتے ہی کھاؤ گے"

لعنت ہے ایسی زندگی پر' میں نے سوچا۔ کیوں نہ اس عورت کا گلا ہی گھونٹ دیا جائے، پتہ نہیں کس مصیبت میں پھنسانے والی ہے' میں اُسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا رہا۔ لیکن اندر سے دل تو لرز رہا تھا، یک بیک وہ پھر نرم پڑ کر بولی "صولت خان کو دیکھتے ہی چیخنا شروع کر دینا، بھاگ جاؤ۔ . . . چلے جاؤ، مارِ آستین . . . مارِ آستین . . . کالی داڑھی لال رومال' لنگڑا اچلا قیامت کی چال . . . چلو بھاگو گندے آدمی . . . تم سب گندے ہو . . . بھائیوں کا گوشت کھانے والے"

میں پاگلوں کی طرح منہ پھاڑے سنتا اور اُس کی شکل دیکھتا رہا۔ اُس کے خاموش ہو جانے پر بھی دیر تک سمجھ میں نہ آسکا کہ میں کیا کہوں۔ اس نے کہا . . . پھر سنو! اور لفظ بہ لفظ زبانی یاد کر لو۔ انداز کچھ ایسا ہی ہونا چاہیئے جیسے تم پر دیوانگی طاری ہو گئی ہو"

میں نے پوچھا "مطلب کیا ہے اس بکواس کا" کہنے لگی کہ فضول بحثوں میں نہ پڑوں' جو کچھ کہہ رہی ہے اس کے خلاف کرنے پر مجھے بھگتنا پڑے گا۔

چار و نا چار پڑھا ہوا سبق رٹنے لگا۔ شاید نکل بھاگنے کی حسرت

دل ہی دل میں رہ جانے والی تھی۔ اگر وہ نامراد صولت خان ٹپک ہی پڑا تو کیا کر سکوں گا۔ سوچتا اور کڑھتا رہا

سورج غروب ہونے سے کچھ ہی دیر قبل صولت خان کی آمد کا غُلغلہ بلند ہوا تھا، بہت بڑی بات تھی کہ کسی پنج صدی کے گھر پہ کوئی پنج ہزاری نزول فرمائے۔ اندر باہر تہلکہ پڑ گیا۔ قطب قلی بری طرح سراسیمگی میں مبتلا ہوا تھا۔ ذرا دیر بعد دیکھا کہ وہ بالکل خادموں کے انداز میں صولت خان کے ساتھ چلتا ہوا میرے حجرے میں داخل ہو رہا تھا۔ میں نے نسترن بانو کا رٹا رٹایا ہوا سبق دُہرانا شروع کر دیا۔ صولت خان جہاں تھا وہی استادہ ہو کر کسی خوفزدہ گیدڑ کی طرح مجھے دیکھنے لگا۔ قطب قلی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، اُس نے کاہے کو کبھی مجھے اس حال میں دیکھا ہوتا۔ جمالی بزرگ آنِ واحد میں "جلالی" بن کر رہ گیا تھا۔

دفعتاً صولت خان میرے قدموں پہ گر پڑا اور یوں گویا ہوا "یا حضرت میں سمجھ گیا کہ آپ کیا فرما رہے ہیں' اب مجھے اپنے قدموں سے جُدا نہ فرمایئے گا۔ چند روز میرے غریب خانے پر بھی قیام فرمایئے' مجھے بھی خدمت کا موقع دیجئے' مجھے بھی عزت بخشیئے کہ خاکِ پا کو سُرمۂ چشم بناؤں اور دین و دُنیا کی دولت سے مالا مال ہو جاؤں"

"بھاگ جا . . . پنج صدی کی توہین نہ کر . . . ہم کہیں نہ جائیں گے۔ ہمارا قطب قلی سلامت رہے"۔ کہنے کو تو کہہ دیا لیکن پھر بوکھلا کر چاروں طرف دیکھنے لگا کہ کہیں وہ حرّافہ تو موجود نہیں۔

"یا حضرت! قطب خان کو کوئی اعتراض نہ ہوگا" صولت خان گڑگڑایا۔

"ہم نہیں جانتے . . . بھاگ جا . . . کالی داڑھی . . . لال رومال لنگڑا چلا قیامت کی چال . . . دفع . . . دُور دفع . . . بھائی کا گوشت بھائی . . . قسائی . . . قسائی . . ." میں اس بکواس میں مزید اضافے پر تل گیا۔

"حضور . . . حضور" آپ کے قطب قلی گڑگڑایا۔" خان زمان کی درخواست منظور فرمایئے' اسی میں میری خوشی بھی ہے اور مجھے اس پر ناز ہے کہ آپ میرے آقا ہیں۔" میں نے اُسے قہر آلود نظروں سے دیکھا اور اس نے بھی جلدی سے میرے پاؤں پکڑ لیے۔

پھر ہوا یوں کہ مجھے اٹھنا ہی پڑا تھا۔ پتہ نہیں اس مکار عورت نے کیا چکر چلایا تھا کہ قطب قلی بھی اس پر بخوشی راضی ہو گیا تھا' ورنہ وہ کہاں تھا مجھے چھوڑنے والا۔ صولت خان نے کہا "مائی صاحبہ کی سواری بھی ساتھ ہی جائے گی۔"

"وہ . . . وہ . . . یعنی نسترن بانو . . . !" قطب قلی ہکلا کر رہ گیا!

"ادب سے نام لو قطب خان" صولت خان ناخوشگوار لہجے میں بولا۔

"شاید تم اُن کے مرتبے سے آگاہ نہیں ہو۔ وہ بھی ولیہ ہیں۔"

بات تیری کی' دل چاہا کہ اپنا سر پیٹ لوں لیکن پھر "مائی صاحبہ" کے ڈر سے ہمت نہ پڑی۔ خدا جانے کیا بلا تھی یہ عورت بھی' اور پتہ نہیں مجھ سے کیا بکواس کرا کے صولت خان پر کس قسم کا اثر ڈالا تھا۔

بہر حال اب میرا فرار ناممکن ہو چکا تھا۔ او مائی صاحبہ تجھے جہنم نصیب ہو۔ مجھے میرے سامان سمیت گھوڑا گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ سامنے کی نشست پر "مائی صاحبہ" تشریف فرما تھیں۔ خود صولت خان مثل چاکروں کے گھوڑے پر سوار ساتھ چل رہا تھا۔ ہمت نہیں پڑ رہی تھی' نسترن بانو کی طرف دیکھنے کی۔

مبادا غصے میں کچھ میرے منہ سے نکل جائے اور راستے ہی میں کٹ جائے گردن . . . وہ بھی خاموش بیٹھی تھی۔

صولت خان کی حویلی کا کیا پوچھنا . . . قلعہ تھی . . . قلعہ' ہم دونوں کے قیام کا ایک ہی جگہ انتظام ہوا۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی اور میں نے تو گویا اپنے ہونٹ سی لئے تھے۔ وہ بھی رات کے کھانے تک کچھ نہیں بولی تھی۔ خاصے کے ہمراہ صولت خان خود بھی آیا تھا۔ اسے دیکھ کر خوامخواہ میری زبان میں کھجلی شروع ہو گئی اور میں نے کہنا شروع کیا "کیا تو ہمیں اس لئے یہاں لایا ہے کہ ہمارا نفس موٹا ہو جائے۔ لے جا یہ سب کچھ' ہم صرف مونگ کی دال اور ادھ جلی روٹیاں کھاتے ہیں۔"

اس پر نسترن بانو کو بھی بولنا پڑا۔ "پیر و مرشد بجا فرماتے ہیں خوان ہائے نعمت ہمارے لئے نہیں ہیں۔ ہم روکھا سوکھا کھاتے ہیں۔"

"یا حضرت گستاخی کی معافی چاہتا ہوں۔" صولت خان گڑگڑایا۔ "ابھی حاضر کرتا ہوں مونگ کی دال اور آدھ جلی روٹیاں۔"

وہ خاصے سمیت واپس چلا گیا اور نسترن بانو دانت پیس کر بولی "یہ تم نے کیا کیا۔ گھامڑوں کے سرتاج۔ اب مجھے بھی مونگ کی دال کھانی پڑے گی۔"

"تم بھی تو ولیہ ہو . . . اکیلا میں ہی تو نہیں ولی اللہ۔"

"خوب سمجھتی ہوں' بتاؤں گی۔"

"اے بے وقوف عورت' سوانگ بھرا ہے تو پوری طرح بھر' ایسا کیوں ہو کہ پکڑی جائے۔"

"اچھا اچھا دیکھوں گی ۔"

"اگر مونگ کی دال کھاتے کھاتے اس قابل رہی تو ضرور دیکھ لیجیو۔"

"سچ کہتی ہوں اس سے بڑی حماقت کسی سے بھی سرزد نہ ہوئی ہوگی۔"

کچھ دیر بعد مونگ کی دال آدھ جلی روٹیوں سمیت حاضر کر دی گئی تھی اور ہم نے صولت خان کی موجودگی ہی میں زہر مار کیا تھا۔ اس کے بعد وہ جانے ہی لگا میں کڑک کر بولا "اس کمرے سے تعیش کا سارا سامان نکال کر باہر کرو، قالین ہٹواؤ اور فرش پر کھجور کی چٹائیاں ڈلوا دو، ہم انہی پر سوئیں گے ۔"

"بہت بہتر حضرت والا ۔" صولت خان نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔ نسترن بانو نے پہلے دانت پیسے تھے پھر اس کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں کمرہ خالی ہوگیا اور فرش پر کھجور کی چٹائیاں ڈال دی گئیں۔

"باہر خادم موجود رہے گا ۔" صولت خان نے کہا۔

"کسی خادم وادم کی ضرورت نہیں، ہم خود ہی خادم ہیں خلق اللہ کے ۔"

"جیسی حضور کی مرضی ۔" صولت خان نے کہا اور چلنے کو ہوا۔ پھر یک بیک رک کر بولا "ناشتے میں کیا پسند فرمائیں گے ؟"

"بھنے ہوئے چنے اور باسی پانی" میں نے کڑک کر جواب دیا، نسترن بانو نے آنکھیں بند کرلیں، چہرے پر ایسے ہی آثار پائے جاتے تھے، جیسے جانکنی میں مبتلا ہوگئی ہو۔

"بہت بہتر سرکار والا ۔" صولت خان نے کہا اور چلا گیا۔ تب میں نے آنکھیں بند کرلیں اور گردن کٹنے کا منتظر رہا۔ نسترن بانو مجھے وحشیانہ انداز میں جھنجھوڑ کر بولی "یہ کیا کر رہے ہو تم ۔"

"الگ ہٹ کر بیٹھ ورنہ بھسم کر دوں گا ۔"

"کیوں شامت آئی ہے ۔"

"اب کہاں ہے شامت ۔ وہ تو گئی۔ یہاں نہیں چلے گی تیری اگر ذرا سی بھی غلطی کی تو خود تیری ہی گردن کٹ جائے گی۔ اب کس منہ سے یہ کہے گی کہ میں بہروپیا ہوں کیونکہ تو نے ہی مجھے ولی کامل ثابت کیا ہوگا تبھی تو یہاں تک پہنچا ہوں ۔"

"اچھا اچھا دیکھوں گی تمہیں ؟" وہ دانت پیس کر رہ گئی۔

"اب اگر تو نے جلدی سے مجھے اس بکواس کا مطلب نہ بتا دیا تو صبح اپنی اور تیری دونوں کی گردنیں کٹوا دوں گا ۔"

"خدا تمہیں غارت کرے، میں تمہارے لئے آسائشیں مہیا کر رہی ہوں اور تمہارا یہ برتاؤ ہے میرے ساتھ ۔"

"میں نے کب کہا ہے کہ تو میرے لئے آسائشیں مہیا کر ۔" وہ کچھ نہ بولی، صاف نظر آ رہا تھا کہ مسلسل دانت پیسے جا رہی ہے ۔

"مسوڑھے ڈھیلے ہو جائیں گے۔ اپنی چاند سی صورت پر رحم کر ۔" میں نے کہا۔

اچانک مسکرائی اور بولی "کیا میں سچ مچ تمہیں چاند سی لگتی ہوں ؟"

"آہستہ بول کہیں کوئی سن نہ لے اور مجھے مار مار کر شاعر بنا دیا جائے ۔"

"بہت چہک رہے ہو، میرا داؤ چل گیا تو بتاؤں گی ۔"

"تیرے داؤ قطب علی کی حویلی ہی میں رہ گئے ہیں، پھر کہتا ہوں کہ یہاں تیری نہیں چلے گی ۔"

"آخر تم چاہتے کیا ہو ؟"

"فی الحال اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتا کہ تو مجھے اس بکواس کے

مقصد و مطلب سے آگاہ کر دے۔"

"ابھی نہیں بتاؤں گی چاہے کچھ ہو جائے۔"

"اچھی بات ہے . . . تو پھر فاقوں کے لئے بھی تیار رہنا چاہیئے تجھے . . ." میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"کروں گی فاقے بھی۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "لیکن تمہارا مستقبل تو کسی نہ کسی طرح سنوارنا ہی ہے . . ."

"کیا سچ مچ تو ہماری مائی صاحبہ ہے؟" میں نے جھلا کر کہا۔

"بکواس کرو گے تو اپنی گردن کٹ جانے کی بھی پروا نہیں کروں گی۔"

"آخر تو ہمیں ہمارے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتی۔"

وہ خاموش رہی پتہ نہیں کیا سوچنے لگی تھی، میں اسے تشویش بھرے انداز میں دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد بڑی لگاوٹ کے ساتھ بولی "اب میں تم سے بچھڑ جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔"

"اور میں بے چین ہوں بچھڑ جانے کے لئے . . . ." میں نے دانت پیس کر کہا۔

"اتنے ظالم کیوں ہو . . ." اس بار اُس نے ایسی نظروں سے دیکھا تھا کہ میں سر سے پیر تک کانپ کر رہ گیا . . . اس نے اسی لہجے میں کہا۔ "آخر یہ کیوں نہیں سوچتے کہ میں تمہارے پیچھے بھاگتی کیوں پھر رہی ہوں۔"

"سوچوں گا سوچوں گا۔" میں نے بوکھلا کر کہا۔ اس کے دیکھنے کے انداز نے مفلوج کر کے رکھ دیا تھا۔

"صبح کو جیسے ہی صولت خان سے ملاقات ہو اپنے اوپر مجذوبیت

طاری کر لینا اور اسی حالت میں جو کچھ کہنا ہے ابھی سے بتاتے دے رہی ہوں۔ خوب اچھی طرح یاد کر لینا۔"

"کیوں تماشا بنا رہی ہے مجھے۔"

"اس کا فائدہ تمہیں کچھ دنوں کے بعد معلوم ہوگا۔"

میں نے بے بسی سے ٹھنڈی سانس لی اور اُس کی شکل تکتا رہا۔

"جب وہ آئے تو اُسے دیکھتے ہی کہنا شروع کر دینا کہ سُور کی تھوتھنی سے اشرفیاں نکل کر رومال میں آتی ہیں . . . ہوشیار رہ، ورنہ مارا جائے گا، لنگڑی چال لال رومال . . . لال رومال . . ."

"آخر یہ سب کیا بکواس ہے؟"

"آہستہ آہستہ رٹنا شروع کر دو اور ہاں اُس وقت اس کی موجودگی میں ہوش کی کوئی بات نہ کرنا۔"

"بھُنے ہوئے چنوں سے ناشتہ کرنے کے بعد ویسے بھی ہوش کی باتیں نہ کر سکوں گا۔"

"میں تمہیں اتنا بیوقوف بھی نہیں دیکھنا چاہتی جتنے اس وقت ثابت ہوتے ہو۔"

"تجھ سے چھٹکارے کی کیا صورت ہوگی؟"

"موت کے علاوہ اور کوئی تمہاری یہ مشکل آسان نہیں کر سکے گا۔"

"آخر مجھ سے کون سی خطا سرزد ہوئی ہے!"

وہ کچھ نہ بولی۔

جُوں توں رات گزاری تھی اور صبح ہوتے ہی نسترن بانو کا پڑھایا ہوا دوسرا سبق رٹنے لگا تھا۔ پھر صولت خان سے مڈبھیڑ ہوئی اور میں نے وہی

سبق دہرانا شروع کر دیا اس بار وہ فرش پر اوندھا لیٹ کر میرے پیروں کو بوسے
دینے لگا تھا۔ نسترن بانو موجود نہیں تھی کسی طرف ٹل گئی تھی یا پھر کہیں چھپی ہوئی
میری نگرانی کر رہی ہوگی۔ صولت خان اُٹھا تو اس کی داڑھی آنسوؤں سے تر
نظر آئی۔ . . . بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا "یا حضرت مجھے پہلے ہی سے شبہ
تھا۔ آپ نے اُس کی تصدیق کر دی۔ زندگی بھر آپ کی غلامی کرتا رہوں گا"
میں نے خاموشی اختیار کر لی تھی اور پاگلوں کی طرح جھوم رہا تھا۔ پھر آنکھیں
بھی بند کر لیں۔ تھوڑی دیر بعد میں نے نسترن بانو کی سرگوشی سنی۔ شاید صولت خان
سے کہہ رہی تھی "اب آپ جائیے جذب و کیف کا عالم طاری ہو گیا ہے"
"اگر آپ فرمائیں تو قوالوں کو طلب کر لیا جائے" صولت خان نے کہا۔
"اس کا نام بھی نہ لیجئے گا۔ میرے پیر و مرشد عطائی نہیں ہیں کہ کیفیت
طاری کرنے کے لئے قوالی کا سہارا لیں گے"
"معافی چاہتا ہوں مائی صاحبہ"
"بس آپ جائیے"
وہ چلا گیا۔ . . . اور نسترن بانو آہستہ سے بولی "اب بس کرو" میں
نے آنکھیں کھول دیں اور دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ پیٹنے لگا۔ وہ جلدی سے
بولی "یہ کیا کر رہے ہو، ہوش میں رہو، اگر کسی نے دیکھ لیا تو . . ."
"اب زندہ رہنے کو دل ہی نہیں چاہتا" میں نے برافروختہ ہو جانے کی کوشش
کرتے ہوئے کہا۔ لیکن اُس پر کیا اثر ہونا تھا۔ دوسری باتیں شروع کر دیں۔ میں
اسی اُدھیڑ بُن میں رہا کہ آخر میں نے صولت خان سے کیا کہا تھا اور وہ کیا سمجھا
تھا۔ اُسے کس بات کا شبہ پہلے ہی سے تھا اور میں نے کس بات کی تصدیق کر
دی تھی۔

دوپہر کو اچانک حویلی میں کہرام مچ گیا۔ مجھے تو نسترن بانو کی طرف سے اجازت
نہیں تھی کہ کمرے سے باہر قدم نکالوں اور دوسروں میں بھی اتنی ہمت نہیں تھی
کہ میرے کمرے میں داخل ہو سکتے۔ چار و ناچار بیٹھا رہا۔ لوگوں کے رونے کی آوازیں
بھی آنے لگی تھیں۔ نسترن بانو نہ جانے کہاں تھی۔ میرا عجیب حال تھا، کبھی اٹھ کر ٹہلنے
لگتا کبھی بیٹھ جاتا۔ کوئی گھڑی بھر بعد نسترن بانو آئی تھی۔ میں نے بے ساختہ پوچھا۔
"یہاں کیا ہو رہا ہے؟" آہستہ سے بولی "ایک حادثہ ہو گیا ہے، صولت خان
کا سوتیلا بھائی کبوتر پکڑنے سہ منزلہ کی چھت پر چڑھا تھا کہ نہ جانے کس طرح نیچے
آ گرا۔ سانس تک نہیں لے سکا، بیچارہ کالی داڑھی والا تھا اور لال رومال رکھنے
کا شائق بھی تھا۔
میرا تو دم ہی نکل کر رہ گیا۔ یہ کیا کروا دیا اس ناہنجار عورت نے . . .
خداوندا میں کیا کروں . . . ؟ میں پاگلوں کی طرح چیخنے ہی والا تھا کہ اس نے
میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولی "بس . . . زندگی چاہتے ہو تو خود
کو قابو میں رکھو، میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ صولت خان کا چھپا ہوا دشمن تھا۔
اُسی نے اس کو زہر دینے کی کوشش کی ہو گی"
"ارے تو اس کا خون میری گردن پر کیوں؟" میں بے بسی سے کراہ کر رہ
گیا۔ وہ میرا شانہ تھپکتی ہوئی بولی "میں تمہیں کبھی نہ بتاتی۔ بہت کمزور دل
آدمی ہو، لیکن خدشہ تھا کہ کہیں تم صولت سے اس کی تعزیت کرنے نہ بیٹھ
جاؤ"
"خدا کے لئے مجھے کسی طرف نکل جانے دے، نسترن بانو، زندگی بھر
تیرا احسان مند رہوں گا"
ہنس کر بولی "بڑے بزدل ہو، مرد بنو۔ اُن شاہان سلف پر

نظر ڈالو جو سروں کے مینار بنوا دیا کرتے تھے۔"

مجھے شاہانِ سلف سے کیا سروکار، مجھے تو معاف ہی رکھو نسترن بانو۔ بزدل ہی رہنے دے۔" وہ ہنس کر بولی۔" میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ کچھ دنوں بعد تم مجھے دعائیں دو گے، بہرحال کان کھول کر سن لو کہ تم اب صولت خان کے سامنے اپنی زبان قطعی بند رکھو گے۔ اس کے بھائی کی موت کا ذکر تک نہیں کرو گے، ایسے بن جانا جیسے تمہیں پہلے ہی سے علم رہا ہو کہ اس کا یہی انجام ہوگا اور تمہیں اس کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں ہے۔"

میں خاموش بیٹھا سنتا رہا۔ اب تو بولنے کی بھی سکت نہیں رہ گئی تھی۔ بار بار خیال آرہا تھا کہ ایک آدمی میری وجہ سے مارا گیا۔ میری وجہ سے کیوں؟ اصل وجہ تو نسترن بانو تھی۔ نسترن بانو آخر تجھ میں کون سی خبیث روح حلول کر گئی ہے۔ پھر اچانک مجھے اپنی صبح والی بکواس یاد آئی اور میں بوکھلا کر نسترن بانو کی طرف دیکھنے لگا۔

"کیا بات ہے؟" وہ مجھے غور سے دیکھتی ہوئی بولی۔

"وہ... وہ سور کی تھوتھنی... جس سے اشرفیاں نکل کر لال رومال میں آتی تھیں۔" میں ہکلایا۔

"اونہہ... ہوگا کچھ..." وہ شانے سکوڑ کر بولی۔

"کیا ہوگا؟ تمہی نے تو یہ سبق بھی پڑھایا تھا۔"

مسکرا کر بولی۔" ابھی سے کیوں جان ہلکان کرتے ہو، وہ معاملہ بھی عنقریب سامنے آجائے گا۔"

"خدا کے لئے مجھے بتا دے۔" میں کراہ کر رہ گیا۔

"ارے وہ کوئی خاص بات نہیں۔ کیا تمہیں میرے سابق شوہر کا چہرہ

یاد نہیں۔ ہونٹ سور کی تھوتھنی کی طرح باہر نکلے ہوتے ہیں، دربار میں ہفت ہزاری کا منصب رکھتا ہے۔ صولت خان سے بڑا عہدیدار ہے، لیکن واہ واہ کیا کہنے صولت خان کے، بے حد ذہین اور بلا کا سازشی ہے۔ تم دیکھ لینا کہ میرا سابق شوہر بھی زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکے گا۔ جلد ہی اس کی موت کی خبر سن کر دل شاد ہو سکوں گی۔"

میرا سر اس بری طرح چکرایا کہ غشی سی طاری ہونے لگی اور آہستہ آہستہ ڈھلکتا چلا گیا۔ پھر کچھ یاد نہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا تھا۔

کسی کی ضد میں کچھ کر بیٹھنا بے وقوفی ہے اور اس کے نتائج پر پچھتانا اس سے بھی بڑی بے وقوفی لیکن پھر بھی زندگی بھر ضد کرتے ہیں اور بے وقوف بھی بنتے رہتے ہیں، ہو سکتا ہے یہی کہلاتی ہو زندگی کی رنگا رنگی۔

نسترن بانو کی ضد میں زندگی کی ہر سہولت اپنے اوپر حرام کر بیٹھا تھا۔ حماقت ہی تھی، لیکن اس حماقت میں لذت کتنی تھی۔ کتنا لطف آتا تھا، جب اسے کھجور کی چٹائی پر بے چینی سے کروٹیں بدلتا ہوا دیکھتا۔ کتنی تسکین مجھے ہوتی تھی، جب وہ نانِ جویں کے خشک نوالے لمبے لمبے گھونٹوں کے سہارے حلق سے اتارنے کی کوشش کرتی ہوئی دکھائی دیتی، لیکن وہ خاموشی سے سب کچھ برداشت کر رہی تھی۔ زبان سے کچھ نہ کہتی البتہ اس کی آنکھیں ضرور زہر اگلتی رہتی تھیں۔ جب بھی دیکھتی ایسے ہی انداز میں دیکھتی جیسے موقع ملتے ہی مجھے کچا چبا جائے گی۔

صولت خان پنج ہزاری ہمارے آگے بچھا جا رہا تھا لیکن لاحاصل! میں نے اپنے اوپر ایسی وحشت طاری کر لی تھی کہ اس کی عقیدت مندی سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ پھر ایک دن میں نے دیکھا کہ ہمارے حجرے کے

دو مسلح آدمی برابر دروازے پر ٹہلتے رہتے ۔
سامنے پہرہ لگ گیا ہے۔
اُن سے براہِ راست تو کچھ پوچھ ہی نہیں سکتا تھا۔ نسترن بانو سے استفسار
کیا تو ہنس پڑی اور بولی "ڈرا دیا تھا۔ میں نے کہ کہیں تم بحالتِ جذب کسی وقت
اٹھ کر باہر نہ نکل جاؤ۔ ایسی صورت میں تمہاری بازیابی ناممکن ہو جائے گی "
میں نے جھلا کر پوچھا " اس کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی ؟" اِٹھلا کر
بولی " میں تمہاری طرف سے مطمئن نہیں ہوں "
" ارے، تو کیا میں تیرا غلام ہوں ؟ " میں نے آنکھیں نکالیں،
" اتنی بحث و تکرار کی کیا ضرورت ہے " وہ جھنجھلائی -
" میں اپنے قطب قلی کے پاس واپس جانا چاہتا ہوں۔ صولت خان
کا کام تو ہو گیا "
" ابھی پورا کام کہاں ہُوا تھا۔ ابھی تو میرا سابق شوہر زندہ ہے "
میں نے ایک بار پھر اپنا سر پیٹ لیا۔ دوسرا خون بھی میری ہی گردن پر
ہوگا ۔ خُدا وندا میں کیا کروں ؟ آخر وہ اُسے کس طرح مار سکے گا جب کہ وہ
ہفت ہزاری ہے، خود اُسے اس کا احترام کرنا پڑتا ہے، اپنے بھائی کی بات
اور تھی۔ اُسی کے ساتھ اسی حویلی میں رہتا تھا اور شومئی قسمت سے کبوتر باز
بھی تھا۔

میں نے نسترن بانو سے کہا " دوسرا کام ہرگز نہ ہو سکے گا "
ہنس کر بولی " ہو کر رہے گا۔ میرا وار کبھی خالی نہیں گیا "
" اچھا، پھر اس کے بعد کیا ہوگا ؟ "
" میں نہیں جانتی کہ اس کے بعد کیا ہوگا "
" میرا کیا ہوگا ؟ تمہاری بات نہیں کر رہا "

" ہمارا جو کچھ بھی ہوگا، ساتھ ہی ہوگا "
بڑے زور کا غصہ آیا آخر یہ کم بخت عورت خواہ مخواہ میری زندگی میں کیوں
گھس آئی ہے ۔ میں نے تو کبھی نہیں چاہا تھا۔ ہر چند کہ حُسن پرست ہوں لیکن
خُدا ایسی عورتوں سے شیطان کو بھی محفوظ رکھے۔ مجھ جیسے خوش مزاج اور
زندہ دل آدمی کو اچھا خاصا کٹکھنا کُتا بنا کر رکھ دیا تھا۔ اُس خبیث عورت نے ۔
ایسے داؤ کرتی کہ بے لبس ہو کر رہ جاتا تھا۔ اب یہی دیکھنا چاہیے کہ حجرے پر
پہرہ لگوا دیا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ موقع ملتے ہی فرار ہونے کی کوشش
ضرور کروں گا اور شاید یہ بھی سوچ رہی تھی کہ کہیں میں کسی طرح اس کے سابق
شوہر کو اس خطرے سے آگاہ نہ کر دوں ۔
بے حد چالاک عورت تھی ۔ پتہ نہیں کس رو میں اپنا یہ راز قبل از وقت
ہی مجھ پر منکشف کر گئی تھی ورنہ اتنے کائیاں افراد سے ایسی غلطی کا امکان کہاں۔
اب غلطی ہو گئی تھی تو اُس کے امکانی نتائج کے تدارک کی کیوں نہ سوچتی، بہر حال
اس وقت باتوں باتوں میں وہ مجھے اُن خطرات سے ایک بار پھر آگاہ کر کے
رخصت ہو گئی تھی، جو اُس سے گلو خلاصی کی جد و جہد کے سلسلے میں مجھے پیش
آ سکتے تھے ۔
اُس کم بخت عورت کے تصور سے پیچھا چھڑانے کے لئے میں نے
دوسری عورت کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ یہ صولت خان کی ایک کنیز
دلربا نامی تھی سچ مچ دلربا تھا۔ چلنے کا عجیب انداز پایا تھا ایسا لگتا تھا جیسے
چل نہیں رہی اٹکھیلیوں کے طرز کا رقص کر رہی ہو۔ بڑی بڑی پلکیں اٹھا کر
آنکھ ملاتی تو ایسا لگتا جیسے دو چاند برابر سے طلوع ہو رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔
لاحول ولا قوۃ ۔ عورت ہی کیوں ؟ صرف عورت ہی کے بارے میں کیوں

سوچا جاتے؟ یہ بھی کوئی عورت ہے۔ ایک عورت کے تصور سے پیچھا چھڑانے کے لئے دوسری کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ ٹھری نا حماقت!

لیکن خداوندا یہ کیا اسرار ہے۔ آدم اور حوا کو الگ الگ بنانے میں کیا قباحت تھی؟ آدم کی پسلی سے برآمد کرانے میں کیا رمز تھا اور پھر بائیں پسلی... یعنی دل کا مقام... گویا آدم کے دل کے آس پاس ہی کہیں نروکش تھیں بی حوا... یا پھر بائیں پسلی سے مرادِ تفسیر دل ہی ہو۔ آدم کے دل سے برآمد ہوئی ہوں۔ بس تو پھر دل کے مکینوں سے روگردانی کہاں ممکن ہے؟ ایک سے متنفر ہو کر دوسری کو گلے کا ہار بنانے پر کیوں نہ مجبور ہو۔ بے چارہ آدم زاد، خود آدم تو اسی کو گلے کا ہار بنائے رہے تھے جس کی وجہ سے جنت بدر ہوئے تھے۔

تو یہ دلربا قیامت تھی۔ ہمارے لئے نانِ جویں اور مونگ کی دال وہی لایا کرتی تھی اور اس وقت تک قریب ہی موجود رہتی تھی جب تک ہم کھانے سے فارغ نہ ہو جاتے، اس طرح دن میں تین بار اس کے دیدار دُربار سے خزانۂ تصور کو معمورۂ تجلیات بنانے کے مواقع نصیب ہو جاتے تھے۔

نسترن بانو سے نظریں چُرا چُرا کر مجھے دیکھتی رہتی۔

اچانک میں سوچنے لگا کیا وہ کسی طرح میرے کام آسکتی ہے اور کام ہی کیا تھا؟ بس یہی نا کہ کسی طرح مجھے یہاں سے نکل جانے میں مدد دے... لیکن آخر اُسے کیا بتاؤں گا کہ کیوں نکل بھاگنا چاہتا ہوں۔ پھر پیرومرشد اتنے مجبور کہ کسی کنیز سے مدد کے طالب ہوں۔ وہ خود کیا سوچے گی؟

شام کو نسترن بانو پھر آئی۔ میں اُس کی شکل تکنے لگا کہ جب بھی آتی تھی کوئی نئی خبر لاتی تھی اس وقت بھی لاتی تھی لیکن یہ دربار کی خبر ثابت ہوتی۔ اس کا اپنا کوئی معاملہ نہیں تھا۔

کہنے لگی "پہلے کبھی نہیں سُنا کہ کسی مسلمان بادشاہ کو سجدہ کیا گیا ہو غازی خان بدخشی نے نئی ہوائی چھوڑی ہے۔ کہتا ہے کہ بادشاہ کو سجدہ کرنا جائز ہے۔ علماء بگڑ گئے ہیں، عجیب ہنگامہ برپا ہے۔ فیضی اور ابوالفضل کہتے ہیں، ملائیک کا سجدہ آدمؑ کو اور بھائیوں کا سجدہ حضرت یوسفؑ کو سجدۂ تہنیت تھا نہ کہ سجدۂ پرستش لہٰذا بادشاہ کو بھی سجدۂ تہنیت جائز ہے۔"

میں حیرت سے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر بولا "یہ تو کہاں سے لایا کرتی ہے خبریں۔ دربار کی خبریں کہاں سے لاتی ہے؟"

اکڑ کر بولی "تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟"

میں نے تڑ سے جواب دیا۔ "ناقص العقل... بھلا جن باتوں سے تجھے کوئی سروکار نہیں، اُن میں پڑنا کہاں کی عقل مندی ہے۔"

"سروکار ہے کیوں نہیں، حضرت آدمؑ اور حضرت یوسفؑ والی دلیل کا کوئی توڑ سوچو، پیرومرشد۔"

"کیوں میں سر کھپاؤں اپنا؟" میں نے غصیلی آواز میں کہا۔

"میں چاہتی ہوں کہ طریقت کے ساتھ ہی ساتھ شریعت کا بھی کچھ علم تمہیں حاصل ہو جائے۔"

"ارے تو کیا تو میری سرپرست ہے؟" میں اُسے کاٹ کھانے کو دوڑا۔ پھر اپنی اس کیفیت پر ہنسی آگئی اس مردود عورت نے اس حد تک چڑچڑا بنا دیا تھا مجھے۔

"پھر کون ہے تمہارا سرپرست؟" وہ بھی جلانے پر تُل گئی۔

"چپ رہ..."

"بہت اکڑ نہ دکھاؤ۔ اگر ابھی سرپرستی سے ہاتھ اٹھا لوں تو در در کی

ٹھوکریں کھاتے پھرو۔"

"میں کہتا ہوں خاموش رہ!"

"بالکل جاہل معلوم ہوتے ہو، میں نے ایک علمی مسئلہ چھیڑا تھا۔"

"کیا رکھا ہے اس علمی مسئلے میں کون سی بڑی مشکل بات ہے، جس کا رد ممکن نہ ہو، مسلمانوں پر نہ ملائکہ کی تقلید واجب ہے اور نہ برادرانِ یوسف کی، پچھلی شریعتوں کو منسوخ کر کے ربِّ انام نے اسلام کا نفاذ فرمایا تھا۔ اگر رسولِ اکرمؐ نے سجدۂ تہنیت کیا ہو۔ اگر واجب ہوتا تو پہلا سجدۂ تہنیت حضور اکرمؐ ہی کو کیا جاتا۔"

وہ ایک دم سے اچھل پڑی اور بولی "واہ کیا نکتہ لائے ہو، بالکل ہی گھامڑ نہیں ہو۔ اب میں تمہارے نام سے یہی دلیل پیش کرتی پھروں گی۔"

"میں پوچھتا ہوں اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"بہت ضرورت ہے، میں کہہ چکی ہوں کہ تمہیں دربار تک پہنچا کر دم لوں گی۔"

"اور پھر میرا لاشہ وہاں سے کون اٹھا کر لائے گا؟"

"کم ہمتی کی باتیں نہ کرو، جو کہوں، اس پر چپ چاپ عمل کرتے جاؤ۔"

"او، خدا کی بندی آخر یہ بھی تو بتا کہ تو مجھ پر اتنی مہربان کیوں ہے؟ میرے لئے اتنا کچھ کیوں کر رہی ہے؟"

"میں خود نہیں جانتی۔" وہ کچھ سوچتی ہوئی بولی "جب پہلی بار میں نے تمہیں دیکھا تو عجیب سا لگاؤ محسوس کیا تھا، پھر جب تم میرے کام آئے تو یہ لگاؤ اور بڑھ گیا اور جب بھی تم میری کوئی بات ماننے سے انکار

کرتے ہو تو دل چاہتا ہے کہ طمانچے مار مار کر منہ لال کر دوں۔۔۔"

"کیا۔۔۔ کیا۔۔۔!" میں حیرت سے منہ پھاڑ کر رہ گیا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں، تمہاری نافرمانی سے بہت دکھ پہنچتا ہے۔"

"او بدبخت یہ تو مادرانہ لگاؤ ہوا۔۔۔"

"بس بدتمیزی نہیں۔۔۔" وہ آنکھیں نکال کر بولی اور میری سمجھ میں نہ آسکا کہ اب اس سے کیا برتاؤ کروں، بس تخت یا تختہ، والا غصہ آتے آتے رہ گیا، کیونکہ اچانک دلربا کی آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا، وہ اندر آنے کی اجازت طلب کر رہی تھی۔ اس کی شکل دیکھ کر آنکھوں میں سرور اور دل میں نور اتر آیا۔

سر ہلا کر اندر آنے کی اجازت دی اور پلکیں جھپکائے بغیر اس کے خدوخال کا جائزہ لیتا رہا۔

"یا حضرت! خان زمان حاضری کی اجازت چاہتے ہیں۔" اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

"ضرور۔۔۔ ضرور۔۔۔ اجازت ہے۔" میں جھومتا ہوا بولا۔ بڑی مترنم آواز تھی، کانوں میں انگبیں ٹپکا گئی۔

الٹے پاؤں واپس گئی تھی اور نسترن بانو نے مجھ پر جھپٹا مارا تھا۔ آنکھیں نکال کر بولی "یہ اس کی طرف کس طرح دیکھ رہے تھے۔۔۔"

"کس طرح دیکھ رہا تھا۔" میں بھی پھاڑ کھانے دوڑا۔

"آنکھیں پھوڑ دوں گی، بتائے دیتی ہوں۔"

"زبان کو لگام دے فاتر العقل عورت، میرے غضب کو نہ للکار۔ بہت چالاک ہو گی، پھر بھی میں مرد ہوں اور تیرا شوہر نہیں ہوں کہ تجھے مجھ کو بالکل ہی بے وقوف

سمجھنے کا حق حاصل ہو گیا ہو۔"

"شوہر۔" وہ حقارت آمیز ہنسی کے ساتھ بولی۔ "تم جیسا گاؤدی میرا شوہر ہو ہی نہیں سکتا۔"

"حالانکہ ہر شوہر گاؤدی ہوتا ہے۔"

وہ جھلا کر اٹھی اور دور جا بیٹھی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے جھومنا شروع کر دیا۔ یاد آ گیا کہ صولت خان کو حاضری کی اجازت دے چکا ہوں، کسی دم آیا چاہتا ہے۔

وہ آیا اور میرے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ مجھے اُس کی آمد کا علم تھا، لیکن لاعلم بنا رہا۔ پھر وہ کھنکارا تھا اور میں نے آنکھیں کھول دی تھیں۔

"کیا بات ہے؟"

"یا حضرت، ایک دشواری میں پڑ گیا ہوں۔" وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"بیان کر۔"

"مجھے ایک مہم پر ملک بنگال جانا پڑے گا۔ میں نہیں جانا چاہتا۔"

"چلا جا۔ ۔ ۔ چلا جا۔ ۔ ۔ چلا جا۔ ۔ ۔" میں نے ہاتھ ہلا ہلا کر پُر زور لہجے میں کہا۔

"یا حضرت!"

"عزت، دولت، شہرت۔ ۔ ۔ عورت! اور کیا چاہیے تجھے؟"

"عورت۔ ۔ ۔" وہ بھونچکا رہ گیا۔

"ہاں، ہاں۔ ۔ ۔ عورت بھی۔"

"مگر حضور، چار بیویاں تو پہلے ہی سے موجود ہیں۔"

"ان میں سے کوئی مر بھی تو سکتی ہے۔"

"سچ حضور" وہ پُرمسرت انداز میں اُچھل پڑا۔

"یا پھر چاروں مر جائیں گی۔"

"مم۔ ۔ ۔ میں۔ ۔ ۔ ضض۔ ۔ ۔ ضرور جاؤں گا۔"

"زلفِ بنگال کھینچ رہی ہے تجھے، چلا جا۔ ۔ ۔ چلا جا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چلا جا۔ ۔ ۔"

"حکم کی تعمیل ہو گی یا حضرت۔"

وہ بڑی سعادت مندی سے میرے قدموں پر جھکا اور فوراً رخصت ہو گیا۔

پھر میں نسترن بانو کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس کی شکل دیکھ کر بے اختیار ہنسی آ گئی۔ اس بُری طرح دانت پیس رہی تھی کہ "کِرر کِرر" کی آوازیں حجرے میں گونجنے لگی تھیں۔

"کیا تکلیف ہے تجھے؟" میں نے پوچھا۔

"میں تمہیں مار ڈالوں گی۔"

"ہوش کی دوا کر، تو کس سے باتیں کر رہی ہے۔"

"ایک اوّل درجے کے احمق سے، آخر اس بکواس کی کیا ضرورت تھی۔"

"بہت ضرورت تھی۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ جلدی سے دفع ہو جائے یہاں سے۔"

"تمہیں اس سے کیا، اگر نہیں جانا چاہتا۔"

"اُسے جانا پڑے گا، زلفِ بنگال اُسے کھینچ رہی ہے۔"

"خدا تمہیں غارت کرے" کہتی ہوئی اٹھی اور حجرے سے نکل گئی۔

اِدھر میں سوچ رہا تھا کہ اب کام بن گیا۔ فرار میں آسانی ہو جائے گی۔ اگر صولت خان موجود نہ ہوا لیکن پھر میں دلربا کی کٹورا سی آنکھیں کیسے دیکھ سکوں گا۔ اس کی مترنم آواز کانوں میں کیسے پڑے گی۔ عجیب سی گدگدیاں دل میں ہونے لگیں ایسا لگتا تھا جیسے مجھے اُس سے عشق ہو گیا ہو۔ . . . لیکن . . . میری حیثیت . . . میں نے اس کی آنکھوں میں اپنے لئے عقیدت و احترام کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھا تھا اگر وہ میرے احساسات سے آگاہ ہو جاتے تو کیا سوچے۔ خداوندا، یہ کس مصیبت کا سامنا ہوا ہے ایک بار پھر نسترن بانو پر غصہ آنے لگا۔ نہ مجھے یہاں لاتی اور نہ اس کی نوبت آتی۔

دن گزرا، رات آئی۔ نسترن بانو نے خاموشی اختیار کر لی تھی اور مجھے کیا ضرورت تھی کہ اُسے بولنے پر مجبور کرتا۔ دونوں اپنی اپنی جگہوں پر سو گئے۔

پتہ نہیں کس وقت آنکھ کھلی اور یک لخت اُٹھ بیٹھنا پڑا۔ نسترن بانو بھی بیدار ہو گئی تھی وہ شور ایسا ہی تھا۔ پوری حویلی شور سے گونج رہی تھی اور بھاگ دوڑ کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے کسی غنیم نے چڑھائی کر دی ہو۔ نسترن بانو نے پہریداروں کو آوازیں دیں لیکن شاید وہ بھی دروازے کے قریب موجود نہیں تھے۔ نسترن بانو دریافتِ حال کے لئے باہر نکل گئی لیکن میں جہاں تھا وہیں بیٹھا رہا۔

تھوڑی دیر بعد واپس آئی اور ہانپتی ہوئی بولی۔ "بڑی بیگم کو سانپ نے ڈس لیا ہے، دیکھتے ہی دیکھتے چٹ پٹ ہو گئیں۔"

میں سناٹے میں آ گیا کیا صولت خان نے اپنی بیوی کا خاتمہ کر دیا کہ بنگال پہنچتے ہی تعداد پوری کر دے یا پھر سچ مچ میں ہی کل جیبھ کا ہوں۔

خاموشی سے نسترن بانو کی طرف دیکھتا رہا۔ انتظار تھا کہ اب وہ کیا کہتی ہے۔

"اسی لئے میں چاہتی ہوں کہ تم اپنی زبان کو قابو میں رکھا کرو۔"

"میری زبان سانپ نہیں ہے جو کسی کو ڈس لے گی۔"

"سانپ نہ ہو گی لیکن اس کا کہا ضرور پورا ہوتا ہے۔ میں دیکھتی ہی آ رہی ہوں۔"

"اگر ایسا ہی ہوتا تو تم میں بولنے کی سکت نہ رہ جاتی۔"

"فضول بحث نہ کرو، چپ چاپ آنکھیں بند کر کے لیٹ جاؤ۔"

"اس سے کیا ہو گا؟"

"میں کہتی ہوں چپ چاپ لیٹ جاؤ۔"

میں نے طوعاً و کرہاً لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

تھوڑی دیر بعد میں نے صولت خان کے رونے کی آواز سُنی کسی سے رو رو کر کہتا ہوا اسی طرف آ رہا تھا۔

"پیر و مرشد نے تو پہلے ہی آگاہ کر دیا تھا کہ تم پہ دوسرا غم بھی پڑنے والا ہے۔"

میں نے آنکھیں کھول دیں اور دیکھا کہ نسترن بانو اٹھ بیٹھی ہے۔ پھر وہ حجرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی تھی۔

"کیا آپ کو علم ہو گیا۔" دروازے کے قریب ہی سے صولت خان کی آواز سنائی دی۔

"بے حد افسوس ہوا خان زمان۔" یہ نسترن بانو کی آواز تھی۔

"کیا پیر و مرشد کو بھی علم ہو گیا؟"

"صولت خان" تیسری اور قطعی اجنبی آواز آئی "کیا یہ تمہارے پیر و مرشد کی اہلِ خانہ ہیں؟"

بڑی بھاری بھرکم اور چونکا دینے والی آواز تھی۔

"نہیں . . . حضرت کی خادمہ ہیں"

"دونوں ایک ہی حجرے میں رہتے ہیں؟" سوال کیا گیا۔

"ہاں . . ."

"یہ غیر شرعی حرکت تمہاری حویلی میں ہوئی ہے"

"ان باتوں کا کیا موقع ہے؟"

"ہے کیوں نہیں؟" گونجیلی اور غصیلی آواز گونجی۔

میں نے آنکھوں میں درّہ کر کے دیکھا . . . نسترن بانو پلٹ آئی تھی اور چٹائی پر بیٹھی بُری طرح ہانپ رہی تھی۔

"خاموش ہو جاؤ رجب خان" صولت نے سخت لہجے میں کہا تھا۔

"خلافِ شرع حرکت برداشت نہیں کر سکتا"

"یہ میری حویلی ہے"

میرے لئے حکم ہے کہ جہاں بھی خلافِ شرع کوئی حرکت ہوتے دیکھو ٹوک دوں"

"جہاں پناہ نے ایسا کوئی حکم کسی کو نہیں دیا"

"صولت خان، میں بادشاہوں کے بادشاہ کی بات کر رہا ہوں"

"اگر تم میری مرحومہ بیوی کے بھائی نہ ہوتے تو بتاتا"

"کیا بتاتے؟"

"اپنے مرشد کی توہین کرنے پر تمہاری گردن اڑا دیتا"

"کیا بکتا ہے صولت خان"

"اچھا تو سنبھال . . ."

یک بیک دو تلواروں کے ٹکرانے کی آواز آئی تھی۔ اور میں بھی بوکھلا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ نسترن بانو کی بُری حالت تھی۔ دونوں ہاتھوں سے بایاں پہلو دبائے ہانپ رہی تھی۔ تلواروں کی شپاشپ سناٹے میں گونجتی رہی، بالکل حجرے کے سامنے صحن میں یہ وقوعہ ظہور پذیر ہو رہا تھا۔ اس لئے اس کا بھی امکان نہیں تھا کہ ہم دونوں چپکے سے نکلیں اور جدھر سینگ سمائیں چل دیں . . . عقل خبط ہو کر رہ گئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کروں۔

ادھر وہ عقل کی پتلی تھی کہ صرف ہانپے جا رہی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تنفس کا دورہ پڑا ہو۔

میں سوچ رہا تھا کہ اگر صولت خان مارا گیا تو ہم بھی نہیں بچیں گے۔ صولت خان کی زندگی ہمارے لئے بے حد اہم تھی، دونوں کی گفتگو سے اندازہ ہوا تھا کہ صولت خان کا مقابل اس کا برادرِ نسبتی ہے کیونکہ اس نے مرحومہ بیوی کے بھائی ہونے کا حوالہ دیا تھا۔ ہو سکتا ہے اُسی بیوی کے بھائی کا جسے سانپ نے ڈس لیا تھا۔

میں جی کڑا کر کے اٹھا اور نسترن بانو کے پاس جا بیٹھا۔ اُس کی تو گھگھی بندھ گئی تھی۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھتی رہی تھی۔

باہر سے تلواروں کی جھنکار برابر آ رہی تھی، ان کے علاوہ اور کسی قسم کی کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ کیا کوئی بھی ایسا نہیں حویلی میں، جو دخل اندازی کر سکے۔ کیا سب کو سانپ سونگھ گیا ہے؟

"کیا ہو رہا ہے نسترن بانو؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔ اُس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا اور صرف ہانپتی رہی۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔

"جنگ فیصلہ کُن معلوم ہوتی ہے"۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ "اگر صولت خان مارا گیا تو ہمارا کیا ہوگا؟"

"سک۔۔۔ سمجھ" وہ بدقت بولی۔ "سوچو جلدی سے"۔

"میری عقل تو تم خود ہی بنی رہی ہو۔ سوچنے کی عادت ہی ترک کر چکا ہوں"۔

"پھر تو۔۔۔ پھر تو۔۔۔ مارے گئے۔۔۔" وہ آگے پیچھے جھولتی ہوئی بولی اور پھر بے ہوش ہو کر ایک طرف ڈھلک گئی۔ تلواریں اب بھی چل رہی تھیں۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

باہر تلواریں چل رہی تھیں اور اندر نسترن بانو بے ہوش پڑی تھی۔ ایسی صورت میں میری حواس باختگی کا کیا پوچھنا۔۔۔ وہ جو میری ولایت کا سرچشمہ تھی، خود ہی حواس کھو چکی تھی پھر مجھے کیا سجھائی دیتا۔ اگر صولت خان مارا جاتا ہے تو گویا اپنا ہی خاتمہ۔۔۔ اگر رجب خان کی آتی ہے تب بھی اپنی وہ ہوا اُکھڑ چکی ہوگی، جو پہلے بندھی تھی۔ اگر میں ایسا ہی باکرامت تھا تو یہ جھگڑا نہ ہونے دیتا۔ اپنی پُراسرار قوت کو بروئے کار لاکر دونوں کو وقتی طور پر مفلوج ہی کر دیتا لیکن یہاں رکھا ہی کیا تھا۔ اگر یہ عورت سر پر سوار نہ ہوگئی ہوتی تو کبھی کا اس پھپھکاک سے نکل چکا ہوتا۔

دفعتاً کسی کی کراہ سُنائی دی اور کوئی دھم سے زمین پر گرا۔ اس آواز کے ساتھ ہی نسترن بانو بھی اٹھ بیٹھی اور بولی۔ "دیکھوں تو، کون گرا ہے"۔

میں ہکا بکا رہ گیا۔ بھلا یہ کیسی بے ہوشی تھی؟ اللہ رے عورت۔۔۔ کسی وقت بھی مکاری سے خالی نہیں رہتی۔ شاید اس لئے بے ہوش بن گئی تھی کہ میری باتیں نہیں سننا چاہتی تھی۔ اب دروازے سے لگی اس طرح جھانک رہی تھی کہ باہر سے دیکھی نہ جا سکے۔۔۔ پھر تیزی سے پلٹی اور میرے قریب پہنچ کر آہستہ سے بولی۔

"اس طرح بیٹھ جاؤ جیسے مراقبے میں ہو۔ ۔ ۔ رجب خان گرا ہے اور صولت خان دم بخود کھڑا ہے۔ اُسے آواز دو اور کہو کہ اندر آئے یہی ہونا مقدر تھا۔"

میں نے سوچا چلو چل گئی کھوپڑی، بہرحال کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ مجھے ہدایت دے کر وہ پھر اُسی گوشے میں جا بیٹھی۔ میں نے اپنی آواز میں کچھ زیادہ ہی گونج پیدا کر کے کہا "صولت خان! ہوش میں آ۔ ۔ ۔ اندر آجا۔ یہی مقدر تھا جو کچھ ہُوا۔ اگر بادشاہ وقت بھی ہمارے خلاف کچھ سوچے گا تو اس کا بھی یہی حشر ہوگا۔"

صولت خان آہستہ آہستہ چلتا ہوا اندر داخل ہوا اور میرے سامنے دوزانو بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"جو کچھ بھی ہوا ہے اس میں میرے ارادے کو دخل نہیں تھا، پیرو مرشدؒ" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ یہ مقدّر تھا۔"

"لیکن اب کیا ہوگا؟ بہن کو سانپ نے ڈس لیا اور بھائی میرے ہاتھوں مارا گیا۔ میں خطرے میں پڑ گیا ہوں، پیرو مُرشد!"

"بیوی کی تدفین کا سامان کر۔" میں اس کے علاوہ بھی کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ نسترن بانو جھپٹ کر قریب پہنچی اور صولت خان سے پوچھا۔

"کوئی آس پاس موجود تو نہیں تھا؟"

"نہیں، وہ سب دوسری طرف ہیں۔"

"کیا وہ ختم ہوگیا؟"

"تلوار کا ہاتھ مارا تھا، گردن شانے سمیت اُتر گئی۔"

"اب خُدا کو یہی منظور ہے کہ ہم یہاں نہ رہیں۔" نسترن بانو نے ٹھنڈی

سانس لے کر کہا۔

"مم۔ ۔ ۔ میں سخت شرمندہ ہوں۔ ۔ ۔ لیکن یہ ناممکن ہے کہ آپ مجھے اپنی خدمت سے محروم کر دیں۔ اسی وقت آپ کو اپنی جاگیر پر روانہ کئے دیتا ہوں۔"

"یہی مناسب رہے گا۔" میں جلدی سے بولا۔

"اور میں اس سلسلے میں جو کچھ بھی کروں گا، آپ اس سے متفق ہوں گے۔"

"بالکل۔ ۔ ۔ بالکل۔ ۔ ۔" میں نے اپنی جان چھڑانے کے لئے کہا۔

"بہت بہتر۔ ۔ ۔ تو میں ابھی حاضر ہوا۔ آپ کی روانگی کے لئے رتھ تیار کرائے دیتا ہوں۔" وہ چلا گیا اور نسترن بانو میرا شانہ ہلا کر بولی۔

"یہ کیا کہہ گیا ہے کہ میں اس سلسلے میں جو کچھ بھی کروں گا آپ اس سے متفق ہوں گے؟"

"کوئی بڑی رقم دے کر ہمیں اپنی جاگیر پر بھجوا دے گا، اور کیا؟" میں نے کہا۔

"بات سمجھ میں نہیں آئی۔ تمہیں وضاحت کرا لینے سے پہلے متفق نہ ہو جانا چاہیئے تھا۔"

"خُدا کے لئے اس وقت میرا دماغ نہ چاٹ۔"

کچھ دیر بعد صولت خان واپس آگیا اور بولا "رتھ تیار ہے پیرو مرشد! لیکن گاڑی بان موجود نہیں ہے۔"

"فکر نہ کر صولت خان! رتھ کے بیل خود ہی ہمیں تیری جاگیر تک لے جائیں گے۔" میں نے جھُومتے ہوئے کہا۔

"لیکن حضور!" وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ میں اس چکر سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا تھا۔

"تو پھر تشریف لے چلیئے" اُس نے بڑے ادب سے کہا اور ہم دونوں کا سامان اٹھا لیا۔ حجرے سے باہر نکلے اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑنے لگے۔ حویلی کے اس حصے میں کہیں نام کی روشنی بھی نظر نہیں آئی تھی، ہم کسی نہ کسی طرح باہر نکلے اور رتھ میں بیٹھ گئے۔ میں رتھ بان کی جگہ بیٹھا تھا۔ مڑ کر دیکھا تو صولت خان نظر نہ آیا۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر بیلوں کو ہنکا دیا لیکن میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں تھا کہ صولت خان کی جاگیر کہاں ہے اور اس وقت تو میں سمت کا اندازہ بھی نہ لگا سکا تھا۔ بس جدھر بیلوں کا رُخ تھا، اِدھر ہی روانگی ہو گئی۔ نسترن بانو میرے پاس ہی پیچھے بیٹھی ہوئی تھی۔ یکایک میرا شانہ جھنجوڑ کر بولی۔

"کیا تمہیں اس کی جاگیر کا راستہ معلوم ہے؟"

"راستہ کیا، مجھے تو نام بھی معلوم نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "بس چپکی بیٹھی رہو۔"

"تم پاگل تو نہیں ہو گئے؟"

"مجذوب . . . . . ہم جیسے پاگل نہیں کہلاتے۔ آدابِ طریقت کو فراموش نہ کرو ورنہ پچھتاؤ گی۔"

اس پر وہ مجھے بُرا بھلا کہنے لگی اور میں چپ چاپ سنتا رہا . . . اور بیلوں کی دُموں پر گُدگُدیاں کرتا رہا۔ بیل دوڑتے رہے . . . . بڑی جاندار جوڑی تھی۔ آخر اس کی بکواس سے تنگ آ کر بولا۔ "میں اس سے کس طرح پوچھتا، جاگیر کا نام اور راستہ؟ کیسا صاحبِ کشف ٹھہرتا، اتنے معمولی سوالات کر سکے؟"

"بس تو پھر اب بھٹکتے پھرو۔"

"نسترن بانو! خدا کا شکر ادا کر کہ ہم اتنی آسانی سے نکل آئے . . . .

عدالت، شہادت سے جان چھوٹی ورنہ کیا میں کسی قاضی کے سامنے جانے کی جرأت کر سکتا ہوں؟"

"کس کا کیا چُرا کر بھاگے ہو تم، کہ قاضی صاحب کا سامنا نہیں کر سکتے؟"

"ضمیر . . . میرا ضمیر، جو میرے رُوپ سے آگاہ ہے۔ قدم قدم پر میری گردن دباتا رہتا ہے۔"

"بس تو پھر میں سوتی ہوں، تم ہانکتے رہو بیلوں کو۔ کہیں نہ کہیں تو پہنچ ہی جائیں گے۔"

"بڑا احسان کرے گی مجھ پر، اگر سو جائے۔"

"ہرگز نہیں سوؤں گی، ارادہ بدل دیا۔"

"کیا تجھے کوئی کشف ہوا ہے؟"

"یہ بات نہیں۔ تم پر اعتبار نہیں رہا۔ مجھے رتھ ہی میں سوتا چھوڑ کر بھاگ نکلو گے۔"

میں کچھ نہ بولا۔ اچھی سجھائی تھی بدبخت نے۔ میں دل ہی دل میں خدا کے حضور گڑگڑانے لگا کہ اُسے نیند آ جائے، کچھ دیر بعد وہ بولی۔ "میں سوتی نہیں ہوں۔"

"اری نیک بخت! تجھے چھوڑ کر بھاگا تو بھوکا مر جاؤں گا۔ مجھے کمانے کے گُر تو آتے نہیں . . . اور بھیک بھی نہیں مانگ سکتا۔"

"تب تو تم مجھے قتل ہی کر دو گے اور میرا اثاثہ بھی ہتھیا لو گے۔"

میں کچھ نہ بولا۔ کہتا بھی کیا۔ اس وقت کوئی دلیل اُس کے دماغ میں نہیں اُتر سکتی تھی۔ ویسے اس میں شک نہیں کہ میں اُسے چھوڑ کر بھاگ تو سکتا تھا، لیکن قتل نہیں کر سکتا تھا۔ مجھ جیسا آدمی جس سے ایک مرغ تک نہ ذبح کیا جا سکتا ہو،

اُس کا ہاتھ کسی انسان پر کیسے اٹھ سکتا تھا۔
بیل دوڑتے رہے اور میں اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرتا رہا کہ کدھر جا رہا ہوں۔

"کہیں تم خود ہی نہ سو جاؤ۔" کچھ دیر بعد وہ میری کمر پر دھموکا رسید کر کے بولی اور میں اُچھل پڑا۔

"سچ مچ اُونگھ رہے تھے کیا؟" وہ زور سے بولی۔ "ہوش میں رہنا کہیں بیل کسی کھائی کھڈ میں نہ کود پڑیں۔"

"بیل آدمی نہیں ہیں کہ دیدہ دانستہ کسی گڑھے میں چھلانگ لگا دیں گے۔ یہ شرف صرف آدمی کو ملا ہے۔"

"نہیں باتیں کرتے جاؤ، ورنہ سو جاؤ گے۔"

"اب کیا سوؤں گا، صبح ہونے والی ہے، لیکن بھوک کے مارے بُرا حال ہو رہا ہے۔"

"میرا خیال ہے رتھ کے نچلے حصے میں صولت خان نے کچھ سامان رکھوایا تھا۔ ہو سکتا ہے ان میں کھانے پینے کی چیزیں بھی ہوں لیکن ابھی نہیں دوں گی۔ یہ جھوٹی بھوک ہے۔ شب بیداری کی وجہ سے اکثر بھوک لگتی ہے اگر ایسے میں کچھ کھا لو تو بدہضمی ہو جاتی ہے۔"

میں دانت پیس کر رہ گیا۔ عجب بلا مسلط ہوئی تھی سر پر۔ قدم قدم پر یہ کرو، وہ مت کرو، اتنی کڑی نظر تو مجھ پر مادرِ محترم نے بھی نہیں رکھی تھی، اتنا حکم نہیں چلایا گیا تھا۔ میں لہو کے گھونٹ پیتا بیلوں کو ہانکتا رہا۔ اب ایک آدھ پرندے کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ گہری تاریکی ملگجے اُجالے میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ ہوا کی روش بدل گئی تھی۔

ذرا ہی سی دیر میں جنگل پرندوں کی آوازوں سے گونجنے لگا۔

"یہ تو ہم کسی جنگل سے گزر رہے ہیں۔" نسترن بانو بولی۔

"خدا کی بندی! اب تو خاصا اُجالا ہو گیا ہے۔ میں بیلوں کو روکتا ہوں نیچے اُتر کر دیکھ، شاید کچھ کھانے کو بھی ہو۔"

"اچھا روکو، میں دیکھتی ہوں۔"

میں نے بیلوں کو روکا اور وہ نیچے اُتر کر رتھ کے پچھلے حصے کی طرف چلی گئی۔ اور میں دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا رہا۔ اسی عالم میں شاید اُونگھ بھی گیا تھا۔ کہ اچانک اُس کی کان پھاڑ دینے والی چیخ سُنی اور بوکھلا کر رتھ کے نیچے آ رہا۔ نسترن بانو رتھ کے عقب میں زمین پر چاروں خانے چت پڑی تھی اور اس کے حلق سے ڈری ڈری آوازیں نکل رہی تھیں کیفیت ایسی ہی تھی جیسے کسی قسم کا دورہ پڑ گیا ہو۔

"ارے یہ کیا ہوا۔ ۔ ۔ اُٹھو۔" میں اس پر جھک گیا۔

"وہ ۔ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ ۔ دیکھو۔" وہ رتھ کے نیچے کے حصے کی جانب ہاتھ اٹھا کر بولی اور میں اُدھر ہی دیکھنے لگا۔ اب اتنا اُجالا پھیل گیا تھا کہ وہ شے دُور سے بھی نظر آ جاتی جس کی طرف اُس نے اشارہ کیا تھا۔ میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور سر چکرانے لگا۔

ایک ایسی لاش رتھ کے نچلے حصے میں پڑی تھی جس کی گردن بائیں شانے سمیت کٹ کر ایک طرف جھول گئی تھی۔ "بھاگو۔ ۔ ۔" وہ اُٹھ کر میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولی۔

"بدحواس ہونے کی ضرورت نہیں، ورنہ مصیبت میں پڑ جائیں گے۔" میں نے کہا اور اُس سے ہاتھ چھڑا کر رتھ کے قریب پہنچا۔ لاش کے ساتھ

زمین کھودنے کے آلات بھی موجود تھے۔ میرے پورے جسم میں تھرتھری پڑ گئی، ایسا
لگتا تھا جیسے زیادہ دیر تک کھڑا نہ رہ سکوں گا۔

میں تیزی سے نسترن بانو کی طرف مڑا۔ وہ پیچھے ہٹ رہی تھی۔ میں نے اس کا
ہاتھ پکڑا اور رتھ کی طرف کھینچنے لگا۔

"نہیں نہیں۔ . . . میں رتھ میں نہیں بیٹھوں گی" وہ ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے
لگی اور مجھے غصہ آگیا۔ زبردستی اٹھا کر رتھ میں ڈال دیا۔ اس کی آہ وزاری اور زیادہ
بڑھ گئی۔ بالکل اسی طرح رو رو کر گڑگڑا رہی تھی جیسے میں سچ مچ اُسے مار ڈالنے
کا ارادہ رکھتا ہوں۔

"کیوں مری جا رہی ہے، ہوش میں رہ، ورنہ کسی بڑی مصیبت میں پڑیں گے۔"
میں نے کہا۔ اور رتھ بان کی جگہ پر بیٹھ کر بیلوں کو آگے بڑھانے لگا اور کوشش
کرنے لگا کہ کسی طرح جنگل کے اندر گھسنے کی راہ نکل آتے۔ عام راستے پر چلنا قطعی مناسب
نہیں تھا۔ میرا اضطراب آہستہ آہستہ کم ہونے لگا، لیکن وہ بدستور ہچکیاں لے کر
روتے جا رہی تھی . . . . ساری ہیکڑی اور تیس مار خانی دھری رہ گئی تھی، اب
کوئی پوچھتا کہ بی نسترن بانو وہ کس بل کدھر گئے جن کی بنا پر مردوں کو ناقص العقل
ٹھہراتی تھی۔

خدا خدا کر کے ایک جگہ سے رتھ کو جنگل کے اندر موڑنے کا موقع ملا، اور
وہ چیخنے لگی "ارے، ارے! اُدھر کہاں، سیدھے چلو۔"

"سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم ہو چکی ہے تو چپکی رہ۔" میں نے جھنجلا کر
کہا۔

"خدایا! کس مصیبت میں پڑ گئی۔"

"اکیلے ہی نہیں پڑی، مجھے بھی ڈالا ہے۔ بہتر ہے کہ زبان بند ہی رکھو۔"

"آخر اِدھر کہاں؟"

"صولت خان سے کیا ہوا وعدہ نبھانے۔ کیا تجھے یاد نہیں کہ اُس نے ہماری روانگی
سے قبل کیا کہا تھا؟"

"کیا کہا تھا؟ مجھے تو کچھ بھی یاد نہیں۔"

"اُس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں اُس کی بہتری کو ہر حال میں مدِنظر رکھوں
گا۔"

"اچھا، تو پھر؟"

"اُس نے جو کام مجھے سونپا تھا، ضرور کروں گا۔"

"کون سا کام؟"

"لاش کے ساتھ ہی گورکنی کے آلات بھی رکھے ہوتے ہیں۔"

"ارے، ارے . . . تو کیا تم اس لاش کو دفن کرو گے؟"

"جب اس نے اتنی آسانی پیدا کر دی ہے تو ضرور کروں گا۔"

"واقعی اوّل درجے کے بے وقوف ہو۔ ارے لاش کو کہیں پھینک کر نکل
چلو۔"

"مسلمان کی لاش ہے نسترن بانو! اور پھر میں تو اسے شہید بھی سمجھتا ہوں،
کیونکہ اس نے ایک خلافِ شرع حرکت کے خلاف احتجاج کیا تھا، جس پر
دونوں کے درمیان جنگ ہوتی اور وہ مارا گیا۔"

"شاید تمہارا دماغ اُلٹ گیا ہے؟"

"نہیں میں پوری طرح ہوش میں ہوں . . . دماغ تیرا اُلٹ گیا
ہے۔"

"میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے رتھ سے اُتر جانے دو۔ جدھر میرا دل چاہے گا،"

چلی جاؤں گی۔"

"بہتر ہے اُتر جاؤ۔" میں نے راسیں کھینچ کر بیلوں کو رد کتے ہوئے کہا۔

"لیکن میرا کہنا نہیں مانو گے۔" وہ چمک کر بولی۔

"ہرگز نہیں، میں مسلمان مُردے کی بے حُرمتی نہیں ہونے دوں گا۔"

"بڑے اچھے ہونا، زمانے بھر کے مکّار؟"

"بنایا گیا ہوں۔ اگر تُو نہ ٹپک پڑتی تو اس تکلیف دہ زندگی سے کبھی کا
نکل گیا ہوتا۔"

"تو اب بھی میرا کہنا مانو۔"

"تجھے اُترنا ہے تو اُتر جا، میرے سر نہ ہو۔"

وہ خاموش ہوگئی لیکن اُتر جانے کا ارادہ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ بس، یونہی
دھمکی تھی شاید۔ میں نے پھر بیلوں کو آگے بڑھایا۔ اب اُس نے بالکل ہی چپ
سادھ لی تھی۔

عام راستے سے ہٹ کر کوس ڈیڑھ کوس نکل آنے کے بعد میں نے بیلوں
کو پھر روکا۔

ایک جگہ خاصی دُور تک مسطح زمین نظر آئی اور مٹی بھی نرم معلوم ہوتی تھی۔
میں نے اتر کر کھدائی کے اوزار نکالے اور قریب ہی کھدائی شروع کر
دی۔ میرے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پیٹ پالنے کے لئے ایسے بہتیرے
کام کر چکا تھا جنہیں مزدوری ہی سے تعبیر کیا جا سکتا تھا۔ . . . نسترن بانو بھی رتھ سے
اُتر آئی تھی اور مجھے حیرت سے دیکھتے جا رہی تھی۔ میں خاموشی سے اپنے کام
میں لگا رہا۔

"میں ابھی تک نہیں سمجھ سکی کہ تم کس قسم کے آدمی ہو؟" اس نے تھوڑی دیر

"میں ہر قسم کا آدمی ہوں نسترن بانو! تم اس فکر میں نہ پڑو۔ . . . اپنے باپ
کی تلاش میں نکلا تھا اور اس وقت یہاں گورکنی کر رہا ہوں۔"

"باپ کی تلاش میں نکلے تھے، پہلے کبھی نہیں بتایا۔"

"ضرورت نہیں پڑی تھی۔ اس وقت تو اماں یاد ا . . . دونوں یاد آ
رہے ہیں۔"

"جو کچھ بھی مقدر میں ہوگا، ضرور پیش آئے گا۔"

"اب تو مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

"میری تو بھوک پیاس ہی مرگئی ہے۔"

"خواہ مخواہ یہ دردِ سر مول لے رہے ہو۔ ویسے بھی اگر تم نے اُسے دفن
کر دیا تو اس کے قاتل کی گردن صاف بچ جائے گی۔"

"اس کا مقدر۔"

"تم سے اعانتِ جرم سرزد ہو رہی ہے پیر و مُرشد!"

"جہاں تمہاری عقل سے اتنے جرائم میں ملوث ہوا ہوں، وہاں ایک اپنی
عقل سے بھی سہی۔"

"میں اسے لاحاصل کام نہیں بلکہ اپنے ضمیر کا تقاضا سمجھتا ہوں۔"

وہ بُرا سا منہ بنا کر دوسری طرف دیکھنے لگی، زمین نرم تھی اور میں نے جلدی ہی
ایک گہرا گڑھا کھود لیا تھا۔ اب مسئلہ تھا لاش کو رتھ کے نیچے سے نکالنے کا۔

"کیا تم لاش کو اتارنے میں میری مدد نہیں کرو گی؟" میں نے کچھ دیر بعد
پوچھا۔

"میں تو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گی۔"

میں نے دل ہی دل میں کہا "جہنم میں جاؤ۔" اور لاش کو تنہا نکالنے کی
کوشش کرنے لگا۔ گردن ایسے بے ڈھنگے پن سے کٹی تھی کہ تسمہ لگا رہ

گیا تھا اور اُسے سنبھالنا دشوار ہو رہا تھا۔ بدقت لاش کو نکال کر زمین پر ڈالا اور
پھر گڑھے کی طرف لے جانے کے لئے جھکا ہی تھا کہ نسترن بانو چھلانگ مار کر
قریب آ کھڑی ہوئی۔

"ٹھہرو۔ . . ٹھہرو۔"

میں سیدھا کھڑا ہو کر اس کی شکل دیکھنے لگا اور وہ بڑی پھرتی سے دوزانو
بیٹھ کر لاش کی جامہ تلاشی لینے لگی۔ میرے سارے جسم میں سرد سی لہر دوڑ
گئی۔ عجیب عورت تھی، پہلی بار لاش دیکھی تھی تو چیخ مار کر گر پڑی تھی، دیکھتے
ہی دیکھتے اس نے ایک ایسی چرمی تھیلی برآمد کرلی جس میں سونے کی اشرفیاں
تھیں۔ میرے سارے جسم سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ چھوٹ پڑا۔ کس دل گردے
کی عورت تھی۔

میں نے بدقت کہا "یہ کیا کر رہی ہو؟"

تڑ سے بولی۔ "آخر اس کا تیجا اور چالیسواں بھی تو کرانا پڑے گا۔ یہ
نیک کام اسی کے پیسے سے کیوں نہ کرایا جائے، ثواب دونا ہو جائے گا
اور پھر یہ رقم، قبر میں اس کے کس کام آئے گی۔"

دلیل معقول تھی، لیکن بے اختیار جی چاہا کہ منہ پر اُلٹا ہاتھ رسید کر
دوں۔

تھوڑی دیر بعد جب لاش کو سپردِ زمین کرکے گڑھے کو پاٹنے لگا تو
وہ بولی۔ "زمین برابر کر دینا۔"

"ہرگز نہیں۔" میں نے کہا۔ "بہت ہی واضح قسم کی قبر بناؤں گا۔
میدان جنگ میں شہید نہیں ہوا کہ . . ."

"تم سے بات ہی کرنا فضول ہے۔" وہ بات کاٹ کر بولی۔ "یہ پوری

ڈیڑھ سو اشرفیاں ہیں۔ نہ جانے رات کو کہاں لئے پھرتا تھا۔"

"تمہارے مقدر کی تھیں نا، پھر کیوں نہ لئے پھرتا۔"

"اب زندگی بھر اس کی رٹ لگائے رہنا۔"

"نسترن بانو! آخر تو کس مٹی کی بنی ہوئی ہے؟"

"چکنی مٹی کی" وہ ہنس کر بولی۔ اب اُس کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا
تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہو۔ تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولی۔ "میں نے اُدھر جنگلی
شریفے کے درخت دیکھے تھے، جو پھلوں سے لدے ہوئے ہیں۔ میں اُدھر ہی
جا رہی ہوں۔ تم قبر پہ بیٹھ کر فاتحہ پڑھو۔"

میں کچھ نہ بولا اور وہ شریفے توڑنے چل دی۔ میں پسینے سے شرابور ہو
رہا تھا۔ چادر بچھا کر قبر کے قریب ہی لیٹ گیا۔ ایسی تھکن محسوس ہو رہی تھی کہ
بس . . . اور میں سوچ رہا تھا کہ اب کہاں اور کیسے رات گزرے گی۔ الجھن
ہونے لگی تو اٹھا اور اپنی گٹھری رتھ سے اُتار کر کھولنے لگا۔ مجھے یاد آگیا تھا
کہ گٹھری میں کچھ اگربتیاں رکھی ہوئی تھیں، کیوں نہ اُن میں سے کچھ سلگا کر قبر پہ لگا دی
جائیں۔

تھوڑی دیر بعد تین دیہاتی اپنے کاندھوں پر بڑے بڑے لٹھ رکھے اسی طرف
آتے دکھائی دیئے اور میں ہونقوں کی طرح قبر کے قریب ہی بیٹھا رہ گیا۔ قریب
پہنچ کر وہ رُکے اور حیرت سے اس قبر کو دیکھنے لگے۔ پھر میری طرف دیکھا۔ مجھ میں
اتنی تاب نہیں رہی تھی کہ ان سے آنکھیں بھی ملا سکتا۔ بس آنکھیں بند کیں اور بیٹھے
بیٹھے جھومنے لگا۔ مجذوبوں کی شکل تو پہلے ہی سے بنی ہوئی تھی۔ میں نے
سوچا، اسی طرح سوال و جواب سے بچ جاؤں گا۔ کبھی کبھی آنکھوں میں درہ کرکے
ان لوگوں کو بھی دیکھ لیتا، جو بُت بنے کھڑے تھے۔

دفعتاً میں نے نسترن بانو کی آواز سُنی "ارے بدبختو! اس طرح کیوں کھڑے ہو، شہید میاں رجب شاہ کے مزار شریف پر فاتحہ پڑھو۔"

میں نے بوکھلا کر آنکھیں کھول دیں۔ وہ تینوں نسترن بانو کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اور نسترن بانو مجھ سے بولی "پیر سائیں! ذرا دیکھئے تو کیا یہ تینوں وہی تو نہیں ہیں؟"

میں نے بوکھلا کر سوچے سمجھے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا۔ اُن تینوں نے کاندھوں سے لٹھ اُتار لئے۔

"ڈرو نہیں" نسترن بانو اُن سے بولی "تم بڑے خوش نصیب ہو۔ کہ پیر سائیں کے خواب میں آئے تھے اور پھر میں نے بھی تمہیں خواب میں دیکھا تھا۔ تم نے ہمیں خواب ہی میں بتایا تھا کہ اس جگہ میاں رجب شاہ۔ ۔ ۔ مدفون ہیں۔"

ایک دیہاتی ہکلا ہکلا کر کہنے لگا کہ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ نسترن بانو تڑ سے بولی "پیر سائیں کو خواب میں ہدایت ہوتی تھی کہ شہید میاں رجب شاہ کی قبر پہ مٹی چڑھا دیں کیونکہ تین سو سال میں قبر زمین کے برابر ہوگئی ہے۔ میاں رجب شاہ تین سو سال پہلے شہید ہوئے تھے اور یہیں دفن کئے گئے تھے، یہ جگہ ہم کو خواب میں دکھائی گئی تھی اور تم تینوں بھی موجود تھے، تم ہی نے بتایا تھا کہ شہید میاں اس جگہ دفن ہیں۔"

دیہاتیوں نے لٹھ زمین پر ڈال دیئے اور جُھک جُھک کر میرے ہاتھ چُومنے لگے۔ ۔ ۔ اور میں ایک بار پھر اس عورت کی نادر الوجود کھوپڑی کا قائل ہوگیا۔

پھر دیہاتی اٹھے اور انہوں نے نسترن بانو سے کہا کہ وہ گاؤں والوں کو اطلاع دینے جا رہے ہیں۔ وہ چلے گئے اور میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نسترن بانو

کو دیکھتا رہا، جو آنچل میں بہت سارے شریفے لئے کھڑی تھی۔ اُس نے شریفے میرے آگے ڈال دیئے اور بولی "لو کھاؤ اور اپنی تاجپوشی کے لئے تیار ہو جاؤ۔ گاؤں سے جلوس آئے گا۔"

میری تو زبان ہی گنگ ہو کر رہ گئی تھی، بس ٹکُر ٹکُر اسے دیکھتا رہا تھا۔

●●

شریفے خوب پکے ہوئے اور میٹھے تھے لیکن مجھے اس وقت کسی بھی شے سے لذت اندوز ہونے کی سُدھ کہاں تھی۔ میں تو یہ سوچے جا رہا تھا کہ پھر پھنسوا دیا اس حرافہ نے۔ رجب خان کی تدفین کے بعد سوچا تھا کہ اب کسی طرف نکل جائیں گے۔

"یہ تو نے اچھا نہیں کیا نسترن بانو۔ ۔ ۔" میں نے بدقت کہا۔ مزید بُرا بھلا کہنے کے لئے الفاظ ہی نہیں مل رہے تھے۔

"تم بس بیٹھے رہو۔" وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "دو روٹیوں کا سہارا کر دیا اوپر سے کہہ رہے ہیں اچھا نہیں کیا۔ کیا خاک پھانکتے پھرتے؟" لاجواب تو کر ہی دیتی تھی۔ پھر بھی کچھ کہنا ہی تھا، لہٰذا میں نے اپنی آواز کسی قدر پُروقار بناتے ہوئے کہا "رجب شاہ ہی نام رہ گیا تھا اور کوئی نہیں سوجھا تھا۔ گردن کٹوائے گی۔"

"کون سی مصیبت آگئی؟" وہ شریفہ نگل کر بولی "اب آئیں گے تو عجب شاہ کہنا شروع کر دوں گی۔ وہ سمجھیں گے کہ پہلے بھی یہی کہا ہوگا۔ وہ غلط سمجھے تھے۔"

اس جواب پر اس کے علاوہ اور کیا کر سکتا تھا کہ اسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھتا۔ ہر مسئلے کا حل نوکِ زبان پر رکھا رہتا تھا۔ بڑے انہماک سے شریفے کھاتی رہی پھر اس طرح چونکی جیسے کچھ یاد آگیا ہو۔ مجھے غور سے دیکھتی رہی۔ اور بولی "اب ایسی غلطی نہیں ہوگی۔"

"کیسی غلطی ؟" میں نے خوش ہوکر پوچھا کیونکہ پہلی بار کسی غلطی کا اعتراف کرنے جارہی تھی۔

بہت بُرا سا منہ بنا کر بولی "اب ہر ایک کو یہی بتاؤں گی کہ تم میرے شوہر ہو"

میں اچھل پڑا اور خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا لیکن وہ پھر سر جھکا کر تسبیح کے بیج نکالنے میں مصروف ہوگئی تھی۔

"خدا سے ڈر نسترن بانو ؟"

"خدا سے نہ ڈرتی ہوتی تو تم کب کے میرے شوہر ہوچکے ہوتے"

"کیا بک رہی ہے۔ ۔ ۔ ؟"

"یقین کرو، تمہاری یتیموں جیسی شکل پر رحم آجاتا ہے ورنہ کب کی تمہیں نکاح میں لاچکی ہوتی"

"بس بس میں یہ بے ہودہ بکواس نہیں سن سکتا"

"پھر تم کیا چاہتے ہو کہ دوبارہ کسی رجب خان سے ملاقات ہوجائے"

اس کا کیا جواب دیتا، دم بخود رہ گیا۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی، بہروپ تقدس کا اور ساتھ نامحرموں کا، ہر ایک کی آنکھ میں کانٹے کی طرح کھٹکتی یہ بات۔

میں دل ہی دل میں پدر بزرگوار کی شان میں گستاخیاں کرنے لگا۔ ایسے ہی زوجہ سے ڈرنے والے تھے تو اپنا ہی جیسا ایک اور کیوں پیدا کر دیا۔ خود تو زوجہ کے ڈر سے روپوش ہوگئے اور مجھے مصیبت میں ڈال گئے۔ پتہ نہیں وہ کون سی منحوس گھڑی تھی۔ جب میں تمہاری تلاش میں نکلا تھا۔ کیا ضروری تھا کہ بیٹے کا مقدر باپ کے مقدر سے بھی زیادہ خراب نکلتا۔ تمہاری تو منکوحہ

تھی باوا جان۔ مجھ پر خواہ مخواہ کی زوجہ مسلّط ہوگئی ہے۔ اب کیا کروں ؟

"کیا سوچنے لگے۔ ۔ ۔ ؟" دفعتہً وہ بولی اور میں چونک پڑا۔

"منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ مصلّے نکالو۔ میں چاہتی ہوں کہ جب گاؤں والے یہاں پہنچیں تو ہم دونوں نماز پڑھ رہے ہوں"

"وضو کے لئے پانی نہیں ہے" میں نے مردہ سی آواز میں کہا۔

"تیمّم کرلو"

مجبوراً یہ ڈھونگ بھی رچانا پڑا۔ ڈھونگ یوں کہہ رہا ہوں کہ نماز کا وقت نہیں تھا۔ لہٰذا اسے ڈھونگ ہی کہیں گے کہ خدا رسیدگان نوافل میں مصروف ہیں۔

بہرحال یہی ہوا۔ ہم نماز میں مصروف تھے کہ ساری بستی وہاں الٹ آئی اور جب تک ہم نے سلام نہیں پھیر دیا۔ قبرستان کا سناٹا طاری رہا۔ وہ آپس میں سرگوشیاں تک نہیں کر رہے تھے۔

سب سے پہلے جو آگے بڑھا تھا، گاؤں کا مکھیا معلوم ہوتا تھا۔

"حضور بستی میں تشریف لے چلیں" اس نے بعد سلام، بصد ادب عرض کیا۔

"نہیں بھائی صاحب" نسترن بانو تڑ سے بولی "ہمیں حکم نہیں ہے کہ شہید میاں عجب شاہ کا آستانہ چھوڑ کر کہیں اور جائیں"

"حضور یہ تو کھلا ہوا جنگل ہے"

"ہوا کرے ہمیں کیا فکر ہے۔ پیدا کرنے والا ہر جگہ موجود ہے بستی ہو یا جنگل"

"تو پھر ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم فی الحال یہاں ایک کٹیا ہی بنادیں"

"سب سے پہلے مزار شریف پر فاتحہ پڑھو" نسترن بانو کڑک کر بولی اور ان بے چاروں نے سہم کر فاتحہ کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں میری ہنسی نہ نکل جائے۔ کیا سادہ لوگ تھے۔

فاتحہ کے بعد نسترن بانو نے پہلے ہی کے سے کڑک دار لہجے میں مکھیا سے پوچھا "ہاں تم کیا کہہ رہے تھے؟"

"میں یہ عرض کر رہا تھا بی بی صاحبہ کو عارضی طور پر یہاں ایک کٹیا بنا دی جائے"

"اس میں کوئی مضائقہ نہیں" نسترن بانو نے کہا۔

سارے ہی دیہاتی کام کرنے پر آمادہ تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک بڑی سی کٹیا تیار ہو گئی۔ میں دل ہی دل میں عش عش کر رہا تھا۔ ساتھ ہی اس خیال سے دم بھی نکل رہا تھا کہ رات اس ویرانے میں تنہا گزارنی پڑے گی۔ یہ کیا سوجھی تھی اس عقل کی پتلی کو۔ آخر بستی میں ہما رے قیام کرنے سے کیا فرق پڑتا۔ شہید میاں کی قبر کہیں جاگ تو نہ جاتی۔ پھر خیال آیا کہ کہیں مجھ سے انتقام نہ لے رہی ہو۔ آخر میں نے بھی تو اسے مونگ کی دال اور نانِ جویں بھگتا دی تھی۔ ضد ہی ضد میں۔

کچھ دیر کے بعد مردوں کی ٹولی رخصت ہو گئی کیونکہ عورتوں کی بہت بڑی ٹولی دکھائی دی تھی۔ میں نے دل ہی دل کہا۔ اب خیریت نہیں۔ وہ چاؤں چاؤں ہو گی کہ کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔

عورتوں نے نسترن بانو کو گھیر لیا اور اس کے ہاتھ پاؤں چومنے لگیں۔ وہ باآوازِ بلند انہیں دعائیں دے رہی تھی۔

پھر وہ سب اس کے سامنے نصف دائرے کی شکل میں بیٹھ گئیں۔ اور میں آنکھیں بند کر کے جھومنے لگا۔ آنکھیں ڈر کے مارے بند کر لی تھیں۔

کہ اُن میں کئی خوش شکل اور دلآویز بھی تھیں اور شیطان مردود ہے کہ جنگل میں بھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔

دفعتاً میں نے نسترن بانو کو کہتے سنا "نہیں نہیں۔ ان کے پاس جانے کی ہمت نہ کرنا۔ وہ کوئی رنگے سیار نہیں ہیں، بسچ مچ خدا رسیدہ ہیں۔ نامحرم عورتوں سے کوسوں دور رہتے ہیں۔ تم ان کی دست بوسی ہرگز نہیں کر سکتیں۔ کوئی اور نہیں، حضرت شاہ ابوالحسن چا چا کوچی ہیں۔ انہیں ہاتھ لگانے والی عورت جل کر بھسم ہو جاتی ہے۔ مجھ پر حضرت شاہ لولوائی کی نظرِ کرم تھی کہ ان سے شادی ہو گئی۔ اے بی بیو! میں بلخ کے ملک التجار کی بیٹی ہوں۔ شہزادیوں کی سی زندگی بسر کرتی تھی کہ ایک رات میرے باپ کے خواب میں حضرت شاہ لُولوائی تشریف لے آئے، فرمایا ہند کے لئے رُخصتِ سفر باندھ اور اپنی بیٹی کو بھی ساتھ لے۔ ہم نے اس کا پیوند تلاش کر لیا ہے۔ اور حضرت نے ان کا نام لیا اور پتہ بتایا بس پھر کیا تھا میرے بابا نے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ حضرت کا حکم کیسے ٹال سکتے تھے۔ ہم بڑی دشواریوں سے ہند پہنچے اور انہیں تلاش کیا لیکن یہ تو اپنے ہوش میں نہیں تھے رشتے کی بات کیسے ہوتی۔ میرے بابا سخت پریشان ہوئے۔ اسی رات حضرت شاہ لُولوائی کی زیارت پھر عالمِ رویا میں ہوئی آپ نے فرمایا کہ ابوالحسن مجذوبِ کامل ہے، اسے نیم کے درخت کے تنے سے باندھ کر نیم ہی کے ڈنڈے سے پیٹو، ہوش میں آ جائے گا جیسے ہی ہوش میں آئے میرے حوالے سے شادی کا پیغام دے دو۔ میرے بابا بیدار ہو کر سخت پریشان ہوئے کہ اب کیا کریں، پھر سوچا کچھ بھی ہو حضرت شاہ لُولُوائی کے حکم کی تعمیل ضرور کرنی چاہیئے پکڑوایا حضرت ابوالحسن کو اور بندھوا دیا نیم کے تنے سے اور پھر جو نیم ہی

کے ہی ڈنڈے سے پٹائی ہوتی ہے تو جھٹ ہوش میں آ گئے، بابا نے بڑی پھرتی سے شادی کا پیغام دیا اور حضرت شاہ لولوائی کا حکم سنایا۔ دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر بیٹھ گئے، پھر ایک زور کا نعرہ لگایا "منظور منظور" اس کے بعد ہی حالتِ جذب کا دور ہو گئی تھی۔ شادی کے بعد تین روز تک ٹھیک ٹھاک رہے تھے اور پھر حالتِ جذب طاری ہو گئی تھی۔ اچھا بی بیؤ اب جاؤ۔ چولہا ہانڈی بھی کرنا ہے مجھے۔"

"ارے نہیں حضرت بی بی" کسی نے کہا "ہمارے ہوتے ہوئے آپ تکلیف کریں گی۔ کھانا ہم پکا کر لائیں گے۔"

"ارے اس کی ضرورت نہیں۔ اپنا بوجھ ہم خود ہی اٹھاتے ہیں، ہمارے لئے یہی حکم ہے۔"

ہاں ہاں اور نہیں نہیں شروع ہو گئی، بڑی مشکل سے وہ بیچاریاں نسترن بانو کو اس پر آمادہ کر پائی تھیں اور وہ جب چلنے کو ہوئیں تو انہیں روک کر بولی، ایک ضروری بات تو رہ ہی گئی ہے، میرے لئے جو دل چاہے پکا لانا لیکن میاں صاحب مونگ کی پتلی دال اور خشک روٹیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں کھاتے۔ اچھے کھانے ان کے سامنے آتے اور یہ روتے روتے بے ہوش ہو گئے روتے جاتے ہیں اور آسمان کی طرف منہ اُٹھا اُٹھا کر کہتے جاتے ہیں "اے اللہ کیا تو اپنے بندوں کو مرغن کھانے کھلاتا ہے، جو میرے لئے بھجوایا ہے۔ مالک! مجھے وہی چاہیئے جو زیادہ تر لوگوں کو نصیب ہے۔"

کتنی عورتیں یہ سن کر رونے لگیں اور میں تو دل ہی دل میں نسترن بانو کے منہ پر طمانچے مار رہا تھا۔ چوٹیاں پکڑ کر اینٹھ رہا تھا اور گلا گھونٹ رہا تھا۔ مردار نے کیسا خوفناک بدلہ لیا ہے۔ خود مُرغن اڑائے گی اور مجھے مونگ کی پتلی دال

خشک روٹیوں سے کھلوائے گی۔ اچھا نسترن بانو تو بھی کیا یاد کرے گی میں دیکھوں گا تجھے۔

وہ چلی گئیں اور میں نے آنکھیں کھول کر اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ وہ دل جلانے والے انداز میں ہنس پڑی اور بولی "ناراض ہونے کی ضرورت نہیں حضرت شاہ چاچا کوچی تمہارا وقار بلند کر رہی تھی ان لوگوں کی نظروں میں۔"

"ہاں ہاں، میں سمجھتا ہوں، میری خدا رسیدگی کے قصیدے پڑھ پڑھ کر انہیں ٹھگتی رہے گی، نسترن بانو اتنی اونچی چھلانگ نہ لگاؤ"

"بس تم بیٹھے جھوتے رہو، تمہیں کیا کرنا ہے، ساری مشقت تو مجھے بھگتنی ہے۔"

"خدا کو کیا منہ دکھائے گی۔"

"بڑھاپے میں بہت اچھی بن جاؤں گی، تم دیکھ لینا۔"

غصے کی زیادتی کی وجہ سے میری زبان اینٹھی جا رہی تھی، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کر ڈالوں۔

وہ لوگ کُٹیا بنا گئے تھے، تھوڑی دیر بعد دو آدمی بیلوں کے لئے چارہ اور پانی لائے، ہمارے پینے کے لئے بھی پانی کا انتظام کیا اور چلے گئے۔

"بس دیکھتے رہو" وہ مسکرا کر بولی "کچھ دنوں کے بعد اس کٹیا کی جگہ ایک عمدہ سی خانقاہ بنی ہو گی۔"

"نسترن بانو، فریب کاری بہت دنوں تک نہیں چلتی میرے اور اپنے حال پر رحم کھا۔"

"یہی کر رہی ہوں میاں چاچا کوچی۔"

"بس اور غصہ نہ دلا۔ یہ تو نے میرے نام میں چاچا کوچی کا کیسا اضافہ کر دیا ہے۔ چاچا کوچی کیا بلا ہے؟"

"میں کیا جانوں" وہ بڑی معصومیت سے بولی "اس وقت یہی زبان سے نکل گیا تھا"

"اور یہ حضرت شاہ لُولواتی کون ہیں؟"

"اب تم بلخ کے اس امیر التجار کا نام بھی پوچھ گئے جس کی میں بیٹی ہوں" وہ ہنس کر بولی۔

"خدا غارت کرے" میں دانت پیس کر رہ گیا۔

بہرحال رات کا کھانا اس نے مزے لے لے کر کھایا تھا اور کئی عورتیں اسے کھلاتی پلاتی رہی تھیں۔ کھانوں کی خوشبو مجھ تک بھی پہنچ رہی تھیں اور میں شدت سے بے چین تھا۔ کتنی دنوں سے ڈھنگ کے کھانے کو ترس گیا تھا۔ پہلے بھی تو اس کی ضد میں موٹا جھوٹا کھاتا رہا تھا۔ تورمے اور پلاؤ کی خوشبو باچھوں میں پانی لانے لگی اور میں تھوک کی پچکاریاں مارتا رہا۔ وہ ان عورتوں سے کہہ رہی تھی "نہیں میاں صاحب تو اس وقت کھاتے ہیں، جب تہجد کے لئے اٹھتے ہیں، ابھی نہیں کھائیں گے، عبادت میں خلل پڑے گا" غصّے کے مارے بیہوش ہو جانے کو جی چاہا، لیکن دل پہ جبر کئے بیٹھا جھومتا رہا۔

ان عورتوں کے ساتھ کئی لٹھ بند دیہاتی آتے تھے، جو انہی کے ساتھ رخصت ہو گئے، کٹیا میں دیا جل رہا تھا اور کٹیا کے باہر گہری تاریکی تھی۔ اس نسترن کی بچی نے ایک حرکت اور کی تھی۔ بیل گاڑی بیلوں سمیت گاؤں بھجوا دی تھی اور کہہ دیا تھا کہ جب ضرورت ہو گی منگوا لی جائے گی۔ یعنی فرار کا ذریعہ بھی ختم کر دیا تھا۔ اب میں ایسا کہاں کا دلیر تھا کہ اندھیری رات میں پیدل کسی جنگل سے فرار ہونے کی کوشش کرتا۔

گاؤں والیاں نسترن بانو سے بچا ہوا اچھا کھانا سمیٹ لے گئی تھیں اور

میرے لئے مونگ کی پتلی دال اور دو عدد جو کی موٹی موٹی روٹیاں ایک گوشے میں رکھی گئی تھیں۔

میرا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ نسترن سے بات بھی کروں، لیکن وہ لمبی سی ڈکار لے کر "الحمدللہ" کہتی ہوئی بولی "میاں صاحب اب تم بھی روٹی کھا ہی لو"

"تو نے میرے ساتھ یہ اچھا نہیں کیا"

"اب میں کیا کروں اس وقت زبان سے تمہارے لئے مونگ کی دال اور خشک روٹیاں ہی پھسل گئی تھیں۔ میں کرتی بھی کیا۔ کھاتے ہی یہی آئے تھے، یہی یاد رہا۔ اب مجبوری ہے اللہ والے اپنا بیان بدلا نہیں کرتے"

میں نے مونگ کی دال زہر مار کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس نے کہا "بھوک لگے گی تو آپ کھاؤ گے" اور ایک کنارے پڑ رہی۔ اس کے اطمینان پر میں حیران تھا جنگل کے سناٹے اور تاریکی میں بھی خوفزدہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ بہرحال وہ ذرا ہی دیر میں خراٹے لینے لگی اور میں بیٹھا اپنی تقدیر کو روتا رہا۔ بار بار جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر اس کا گلا گھونٹ دوں۔ بھانت بھانت کے جانوروں کی آوازیں رات کے سناٹے میں بڑی بھیانک لگ رہی تھیں، ایسے میں نیند کہاں، پیٹ کی آگ الگ جھلسائے دے رہی تھی۔ بھوک جب ناقابل برداشت ہو گئی تو اٹھا اور جھک مار کر پتلی دال اور خشک روٹیوں سے سمجھوتہ کر لیا۔

دوسری صبح ناشتے میں پھر تر مال آیا تھا لیکن مجھے کیا میرے لئے تو وہی خشک روٹی تھی جس پر تھوڑا سا مکھن رکھ دیا گیا تھا۔ وہ حرافہ، البتہ حلوا پراٹھے اڑا رہی تھی۔ ناشتے کے بعد گاؤں کی عورتیں نسترن کی منتیں کرنے لگیں کہ

وہ ان کے ساتھ گاؤں چلئے جب وہ کہے گی اسے یہاں پہنچا دیا جائے گا سواری کے لئے پالکی لائی تھیں۔ نسترن تو دل سے یہی چاہتی تھی کہ کچھ اسی قسم کا کاروبار چل پڑے۔

بڑے ٹھسے سے پالکی میں بیٹھی تھی اور چل دی۔ . . اور میں آنکھیں بند کئے اُلوؤں کی طرح جھومتا رہ گیا تھا۔ پھر میں نے تہیہ کیا کہ اس مردود عورت کی ہوا ضرور اکھاڑ دوں گا، خواہ مجھے دَر دَر کی ٹھوکریں ہی کیوں نہ کھانی پڑیں، میرے لئے کم بخت نے نہ جی بہلنے کا سامان ہونے دیا تھا اور نہ لذتِ کام و دہن کی بات بننے دی تھی۔ عورتوں کو ڈرا دیا تھا کہ وہ میرے قریب پہنچتے ہی جل کر بھسم ہو جائیں گی اور کھانے میں مونگ کی دال۔ . . خداوندا میں کیا کروں۔ دو تین بار سر پہ دو ہتھڑ مارے اور پھر آنکھیں بند کر کے جھومنے لگا۔

کچھ دیر بعد کسی بیل گاڑی کے پہیوں کی چرخ چوں سنائی دی۔ کُٹیا سے جھانک کر دیکھا ایک بیل گاڑی پہ اینٹیں لدی چلی آ رہی ہیں، کچھ مزدور بھی ساتھ تھے اور شاید وہ مکھیا کا ایک ملازم تھا، جو انہیں کچھ ہدایات بھی دیتا جا رہا تھا۔ پھر بات سمجھ میں آگئی۔ قبر کو پختہ کرنے کا اہتمام کیا جا رہا تھا، واہ رے احمقو۔ شاید نسترن ٹھیک ہی کہہ رہی تھی، یہاں خانقاہ ضرور بنے گی۔

مزدوروں نے کام شروع کیا اور میں آنکھیں بند کئے بیٹھا جھومتا رہا، لیکن نسترن بانو کے خلاف غصہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ . . عجیب سی بے بسی اس پہ طاری ہو کر رہ گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی ہزار پا کی طرح میری روح تک سے چمٹ کر رہ گئی ہو۔

وقت گذرتا رہا۔ قبر بھی پختہ ہو گئی اور وہاں ہر وقت ہی کوئی نہ کوئی موجود رہنے لگا۔ جمعرات کو باقاعدہ فاتحہ خوانی ہوتی اور لنگر تقسیم ہوتا اور میری تو

گویا پوجا شروع ہو گئی تھی۔ آنکھیں کھول کر جس کی طرف بھی دیکھ لیتا وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا۔ کیسے ضعیف الاعتقاد لوگ تھے، سارے کے سارے نومسلم معلوم ہوتے تھے۔ سادھو پرستی اور برہمن پرستی کی خو بدستور برقرار تھی، صوفیا کرام اور اولیاء اللہ کی کوششوں سے کلمہ گو تو ہو گئے تھے، لیکن انہوں نے اپنے فرائض میں کوتاہی نہ کی تھی جو عظمتوں کے مینار پر چڑھے علم الکلام کے مینڈھے لڑایا کرتے تھے انہیں کیا پڑی تھی کہ برہمن پرستوں کو سیدھی راہ دکھاتے، کیونکہ برہمنوں کا کردار تو اب خود انہیں ادا کرنا تھا۔ . . ہائے تیری نسترن بانو کی۔ . . خدا تجھے غارت کردے، کیسے کیسے فاسد خیالات کی آماجگاہ بن کر رہ گیا ہوں۔ مجھے کیا لینا برہمنوں سے یا کیا دینا پجاریوں کو۔ میں تو اپنے عذاب میں گرفتار تھا۔ اب یہاں سے کیونکر چھٹکارا ہو گا۔ خداوندا میں کیا کروں اب تو نسترن بانو کی عدم موجودگی میں بھی فرار ناممکن ہو گیا ہے کیونکہ ہر وقت مزار شریف پہ دو چار عقیدت مند سر جھکائے بیٹھے نظر آتے۔

بات اب صرف اسی گاؤں تک محدود نہیں رہی تھی۔ گرد و نواح کی دوسری بستیوں کے لوگ بھی آنے لگے تھے۔

آج شام کو گاؤں سے واپس آنے کے بعد نسترن بانو کسی قدر متفکر نظر آ رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا لیکن استفسارِ حال کی ضرورت نہ سمجھی اور شاید وہ موقع کی منتظر تھی۔ رات کے کھانے کے بعد چاروں طرف سناٹا چھا گیا تو میرے قریب آئی اور بھرائی ہوئی آواز میں گویا ہوئی "بڑا غضب ہو گیا؟"

"جہاں تو ہو گی وہاں اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے" میں نے کہا۔

"سنجیدگی سے سنو۔ صولت خان مارا گیا۔ رجب خان کے بھائیوں نے

اسے قتل کر دیا اور انہیں اپنے بھائی کی لاش کی تلاش ہے۔"

"ہماری تلاش میں تو نہیں ہیں" میں بوکھلا کر بولا۔

"خدا ہی جانے۔ جھگڑا تو ہماری ہی وجہ سے ہوا تھا۔"

"لیکن تجھے کیسے علم ہوا۔؟"

"جنک پور کے جاگیر دار کا ایک کارندہ گاؤں کے مکھیا کے پاس آیا تھا۔ اسی نے بتایا ہے۔"

"ہمارا ذکر تو نہیں کیا تھا؟"

"نہیں میں نے کوئی بات نہیں سنی۔"

"اب کیا ہوگا؟"

"ہمت نہ چھوڑو۔" وہ میرا شانہ تھپک کر بولی۔ "میں تو خوفزدہ نہیں۔ بس کل اتنا کروں گی کہ صولت خان کے رتھ کو تڑوا کر چور چور کرا دوں گی اور بیلوں کو راہِ خدا خیرات کر دوں گی۔"

"ہاں ہاں اُس کی روح کو بھی تو کچھ ثواب پہنچانا چاہیئے۔" میں جلدی سے بولا۔

"بس اب بہت احتیاط سے زندگی بسر کرنی پڑے گی۔"

"میں تو کہتا ہوں کہ کسی طرح یہاں سے نکل چلو۔ پتہ نہیں کب کون ہماری طرف انگلی اٹھا دے۔"

"چپ چاپ بیٹھے رہو۔ کیا سمجھتے ہو مجھے۔ اتنے ہی دنوں میں گاؤں والوں پر ایسا سکہ بٹھایا ہے کہ ہماری طرف ٹیڑھی نظر سے دیکھنے والا زندہ نہیں رہ سکتا۔"

میں گھُٹی گھُٹی سی آواز میں "اللہ اللہ" کرنے لگا۔

- - - - - - -

"مزار شریف" کو نہ صرف پختہ کر دیا گیا بلکہ اب اُس پر گلکاریاں بھی کی جا رہی تھیں، ساتھ ہی حُجرہ شریف کی تعمیر بھی شروع ہو گئی تھی۔ نسترن بانو ہر وقت بندۂ عاجز پر اپنی حکمتِ عملی کی دھونس جماتی رہتی۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ اب میں فرار ہونے کی کوشش نہیں کروں گا کیونکہ دن بھر تو میرے پاس گاؤں والوں کا مجمع لگا رہتا تھا اور رات کو وہ خود سر پر مُسلط ہو جاتی تھی۔ ادھر مونگ کی پتلی دال اور خشک روٹیوں نے میرا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ چہرے کی چمک دمک جاتی رہی تھی۔ . . . اور وہ تھی کہ نکھرتی ہی جا رہی تھی۔

ایک رات غور سے میری طرف دیکھتی رہی اور بولی۔ "تمہاری عمر چالیس سال ہے نا؟"

مجھے ہنسی آ گئی۔ "جب بھی بولے گی، بے تکی ہی بولے گی۔"

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔" چڑھ کر بولی۔

"کہاں کی ہانک رہی ہو۔ . . . میں تو ابھی بیس کا بھی پورا نہیں ہوا۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں تو لوگوں کو تمہاری عمر چالیس ہی بتاتی ہوں۔"

"اور وہ یقین کر لیتے ہیں؟"

"کیسے یقین نہ کریں گے۔ یہ تو تمہاری کرامت ہے کہ چالیس سال کے ہونے کے باوجود بھی بیس سے کم کے نظر آتے ہو۔ بس یہ داڑھی بھی کسی طرح جلدی سے بڑھ کر گھنی ہو جاتی۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لی اور چھت کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ اس طرح منہ کیوں بنا رہے ہو؟" نسترن بانو نے ڈپٹ کر پوچھا۔

"قسمت کو رو رہا ہوں۔"

"آہستہ بولو۔ کسی نے سن لیا تو کیا سوچے گا۔"

"کیا سوچے گا؟" میں نے جھنجھلا کر پوچھا۔

"یہی کہ اتنے بڑے ولی اللہ ہو کر بھی قسمت کو کوس رہے ہیں، لیکن میں پوچھتی ہوں کیا تمہیں شرم نہیں آتی۔ بیٹھے بیٹھے کی کھا رہے ہو، اور ناشکری کرتے ہو۔"

"مونگ کی پتلی دال اور سوکھی روٹیاں کھا کر شکر کس بات کا کروں؟"

"وہ تو چھ ماہ تک کھانی پڑیں گی۔"

"کیا بک رہی نسترن بانو ۔ ۔ ۔ ؟"

"چھ ماہ سے کم کا چلہ تو تم کرتے ہی نہیں۔ میں لوگوں سے کہہ چکی ہوں۔"

"لوگوں کی ایسی کی تیسی۔ اب مجھ سے نہیں کھائی جاتیں سوکھی روٹیاں"

"اچھی طرح بھگو کر کھایا کرو۔" اُس نے چمکار کر کہا۔ "بہت پتلی دال ہوتی ہے۔"

دل چاہا کہ اٹھ کر جوتا سنبھالوں اور ایک نہ گنوں، لیکن ۔ ۔ ۔ لیکن کچھ بھی نہیں۔ صبر کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

میں نے خاموشی اختیار کر لی اور پھر میری شکل تکنے لگی، میں نے اس کی طرف سے منہ پھیرا ہی تھا کہ بولی "ذرا اِدھر تو دیکھنا۔"

"کیا ہے؟" میں نے جھلا کر پوچھا۔

"واقعی مونگ کی دال کی وجہ سے تمہاری رنگت کچھ مدھم پڑ گئی ہے۔"

"پڑ جانے دے، تیرا کیا جاتا ہے؟"

"اور چڑچڑے بھی ہو گئے ہو۔"

"بس دیکھ، خاموش ہو جا ۔ ۔ ۔"

"پھر آواز اونچی ہوئی تمہاری۔ کیوں شامت آئی ہے۔"

"خواہ مخواہ کیوں چھیڑتی رہتی ہے مجھے۔"

"اگر اتنا بھی نہیں بولو گے تو زبان سُوکھ جائے گی ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ تمہارا چہرہ نورانی ہونا چاہیئے۔ اس کے لئے میں نے ایک تدبیر سوچی ہے، تمہارا جی بھی بہل جائے گا۔"

میں پھر خاموش ہو گیا۔

"خیر ۔ ۔ میں ابھی نہیں بتاؤں گی پہلے تیاری کر لوں۔"

پتہ نہیں اب کیا کرنے والی تھی۔ میں نے بوکھلا کر پوچھا۔ "کاہے کی تیاری کرے گی؟"

"تمہارا چہرہ نورانی کرنے گی۔"

"صاف صاف بات کر ۔ ۔ ۔"

"پہلے تم اپنا لہجہ ٹھیک کرو۔" وہ آنکھیں نکال کر بولی۔ "کیا تمہاری لونڈی ہوں کہ یہ کر اور وہ نہ کر۔ . . ."

"اچھا شہزادی صاحبہ۔" میں نے جل کر کہا۔ "دُرج دہَن کو وا فرمایئے۔"

"چلو، سو جاؤ۔ کل بات کروں گی۔" اس نے کہا اور اپنے بستر پر لیٹ کر میری طرف سے کروٹ لے لی اور مجھے الجھن میں ڈال کر خود تھوڑی ہی دیر میں خراٹے لینے لگی۔

آخر اب کیا گُل کھلانے والی ہے۔ اس کا کیا مطلب ہوا کہ چہرہ بھی نورانی ہو جائے گا اور میرا جی بھی بہلے گا۔ ہائے کس مُصیبت میں پھنس گیا۔ کیسی دُرگت بنا رہی ہے۔ خوش قسمت تھا اس کا شوہر جس کا پیچھا خود اسی نے چھوڑ دیا تھا لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ روحانی معالج بن کر میں خود اپنی روح کو شیطان کے حوالے کر رہا ہوں۔ چڑیل کی طرح چمٹ گئی تھی۔

بچپن میں جب کبھی میں اپنے سر میں خوشبودار تیل ڈالنے کی ضد کیا کرتا تھا تو میری ماں کہتی تھی "ارے باؤلا ہوا ہے بیچے سر میں خوشبودار تیل ڈالتے ہیں تو چڑیل چمٹ جاتی ہے۔" اے میری ماں تیرے اس قول نے مجھے جوانی میں بھی خوشبودار تیل کے استعمال سے باز رکھا۔ پھر یہ چڑیل کیسے چمٹ گئی۔ اب میں کیا کروں؟ میں کس پیر سے اپنی جھاڑ پھونک کراؤں کس سیانے سے تعویذ لوں کہ اس نے خود مجھے ہی پیر بنا دیا ہے اور مزید بناتی چلی جا رہی ہے۔

اسی الجھن میں نیند آگئی اور رات بھر ڈراؤنے خواب دیکھ دیکھ کر چونکتا رہا۔ صبح کاذب سے قریب والا خواب اتنا ڈراؤنا تھا کہ نیند بالکل ہی اُڑ گئی

اور وہ کیا مزے سے پڑی سو رہی تھی۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور بصارت پر یقین کرنے کو دل نہ چاہا کہ یہ وہی نسترن بانو ہے۔ بے خبری کی نیند میں کتنی معصوم نظر آ رہی تھی۔ نہ ہونٹوں میں تنفر آمیز کھنچاؤ تھا اور نہ پیشانی پر وہ شکن تھی جو کسی کی طرف دیکھتے وقت پڑ جایا کرتی تھی۔ میرا ذہن بہکنے لگا، دنیا جانتی ہے کہ وہ میری بیوی ہے تو پھر . . . تو پھر . . . کیوں نہ . . . . . .

اچانک وہ کسمسائی اور ٹک سے آنکھیں کھول دیں . . . توبہ توبہ استغفراللہ شکر ہے کہ دل میں شیطانی وسوسہ آتے ہی جاگ پڑی . . . ورنہ، اُف خدایا کیا واقعی چڑیل ہے، ورنہ دل میں خیال آتے ہی جاگ کیسے پڑی؟

"اس طرح بیٹھے کیا دیکھ رہے ہو؟" وہ غُرّاتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔

"کک . . . کچھ نہیں . . ." میں ہکلا کر رہ گیا۔

"ضرور کوئی بات ہے؟ بتاؤ . . ." اُس نے آنکھیں نکالیں۔

"ارے کچھ نہیں . . . معاف کرو . . ." میں پیشانی پر ہاتھ مار کر بولا۔

"میرا گلا گھونٹ دینے کی سوچ رہے تھے کیا؟"

"میں سوچتا نہیں کر گزرتا ہوں۔"

"شکل دیکھی ہے کبھی اپنی؟"

"تمہارا گلا گھونٹنے کے لئے اپنی شکل دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"میں نے کیا بُرائی کی ہے تمہارے ساتھ۔ پڑے پٹے کھا رہے ہو، میری بدولت۔"

"کسی دن شہنشاہِ ہند بھی بن جاؤں گا، تیری بدولت۔"

"چلو بکواس بند کرو اور لیٹ کر سو جاؤ۔"

"صبح ہونے والی ہے۔"

"تو پھر اُٹھو اور وضو کر کے نماز پڑھ ڈالو۔"

"تم پر فرض نہیں ہے کیا؟"

"مجھ سے بحث مت کیا کرو۔" اس نے کہا اور کروٹ بدل کر میری طرف پشت کر لی۔ میں اب بھی یہی سوچے جا رہا تھا کہ آخر اچانک جاگ کیسے پڑی تھی۔ کیا سچ مچ اُس پر کسی جن کا سایہ ہے، مگر جنات بھی بھلا دِل کی بات کیوں کر جان سکتے ہیں وہ تو خدا کے علاوہ اور کسی پر روشن نہیں ہو سکتی یا پھر وہ خود ہی بہت پہنچی ہوتی ہے اور مجھے خواہ مخواہ اپنے ساتھ گھسیٹتی پھر رہی ہے،

بہر حال پھر مجھے نیند نہیں آئی تھی اور صبح ہو گئی تھی، اس کے بعد وہی روزمرہ کے معمولات۔ گاؤں سے آتے ناشتے سے فارغ ہو کر وہ بولی "آج سے تمہاری سالگرہ کا ہفتہ شروع ہو رہا ہے۔"

"کیا شروع ہو رہا ہے؟" میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر پوچھا۔

"سالگرہ کا ہفتہ۔ آج سے جلال رخصت ہو گیا اور ہفتہ بھر کے لئے جمال آ رہا ہے۔"

"یہ جلال اور جمال کون ہیں؟" میں نے آنکھیں نکالیں۔

"نرے جاہل ہو۔ ارے اب تک جلالی پیر تھے، آج سے ہفتہ بھر کے لئے جمالی ہو گئے ہو۔"

خداوندا اب کیا کرنے والی ہے اور مجھ سے کیا کرائے گی۔ میں احمقوں کی طرح اُس کی صورت تکتا رہا اور وہ کہتی رہی۔

"مطلب یہ ہے کہ آج سے تم آنکھیں بند کئے، بیٹھے جھومتے نہیں رہو گے

لوگوں سے ہنسو بولو گے بھی، ان کی فریادیں سنو گے اور اُن کے لئے دُعا کرنے کے وعدے کرو گے۔"

"اب مزید پریشانیوں میں کیوں مبتلا کرنا چاہتی ہو؟"

"کیوں اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟"

"میں اُن سے کیا باتیں کروں گا؟"

"یہ تمہارے سوچنے کی بات ہے، میں کیا جانوں . . . . ؟ ہاں یہ بات تو بھول ہی گئی کہ ہفتہ بھر تک عورتیں بھی تمہیں ہاتھ لگاتی رہیں گی، لیکن جل کر خاک نہیں ہوں گی۔"

"عورتیں ہاتھ لگائیں گی؟" میں بدک گیا۔

"ہاتھ نہیں لگائیں گی تو پھر تمہارا چہرہ نورانی کیسے ہو گا۔"

"پتہ نہیں کیا اُوٹ پٹانگ ہانکے جا رہی تھی۔ کچھ پلّے نہیں پڑ رہا تھا تھوڑی دیر تک میرے چہرے پر نظر جماتے رہی پھر مسکرا کر بولی۔" وہ تمہارے چہرے پر اُبٹن لگائیں گی اور پھر چاند سی شکل دیکھنے کے قابل ہو گی۔"

"اب بے سری ہونے لگیں۔" میں جھینپ کر مسکرایا۔

"ہے ہے . . . ذرا ادھر تو دیکھو . . . تم مسکرا بھی سکتے ہو۔"

"دیکھو، نسترن بانو اچھا نہیں ہو گا۔"

"سب اچھا ہی ہو گا۔ تم فکر نہ کرو۔ میں گاؤں جا رہی ہوں، وہاں سے تمہارے لئے اُبٹن کا بندوبست کرنا ہے۔ چپ چاپ رہنا، اُبٹن لگاتے وقت وہ منتیں مانیں گی! جو کچھ کہیں اس پر صاد کرتے جانا۔ اولاد مانگیں تو اولاد دینا۔ دولت مانگیں تو دولت دینا، بہر حال، کسی معاملے میں بھی انکار کا لفظ زبان سے نہ نکلے۔"

میرا سر پھر چکرانے لگا۔ وہ یہ سب کچھ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی۔ میں نے ابھی کچھ کہنا ہی چاہا کہ کود کر پالکی میں بیٹھ گئی جو ناشتے کے ساتھ ہی اس کے لئے آیا کرتی تھی اور چلتے چلتے کہہ گئی۔ "بھولنا نہیں۔ آج سے زبان کھل گئی ہے؟"

ہر وقت کسی نہ کسی اُلجھن میں مبتلا رکھتی تھی، ابھی تک یہ ہوتا آیا تھا کہ لوگ میرے پاس آتے اور حلقہ بنا کر بیٹھ جاتے۔ آپس میں سرگوشیاں کرتے رہتے، اور میں آنکھیں بند کئے بیٹھا جھومتا رہتا اگر کوئی اپنی عرض داشت پیش کرتا تو جھومنا ترک کر کے آنکھیں کھولے بغیر اُسے سُننے لگتا اور اس کے خاموش ہوتے ہی پھر جھومنا شروع کر دیتا۔ نہ آنکھیں کھُلتیں اور نہ لب ہلتے۔ اِس طرح کسی کی عرضداشت سُن لیتا اور کسی کی نہ سنتا۔ یعنی جھومنا ترک نہ کرتا۔ اس طرح یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ پوری نہ ہونے والی مرادوں کی عرضداشت پر میں جھومنا ترک نہیں کرتا جس کی عرضداشت پر میں جھومنا ترک کر دیتا، وہ خوشیاں مناتا پھرتا کہ مراد ضرور بر آئے گی۔

دن بھر یہ سب کچھ ہوتا اور رات کو میں اپنا مُنہ پیٹ پیٹ کر توبہ تلّا کرتا اور لسترن بانو کو سلواتیں سُناتا۔

بہرحال اَب مسئلہ یہ تھا کہ جن لوگوں سے اب تک بات نہیں کی، اُن سے کیا کہوں گا۔ ذرا ہی سی دیر میں لوگوں کی آمد شروع ہو جائے گی۔ ہاتھ پیر پھولنے لگے تھے کہ ایک آدمی دکھائی دیا جو اسی طرف آرہا تھا کچھ قریب آیا تو بالکل اجنبی لگا، اس سے پہلے کبھی میرے حلقے میں نہیں دکھائی دیا تھا۔ اب اس قدر بھی آنکھیں بند نہیں رکھتا تھا کہ ان کی صورتوں سے آشنا نہ ہوتا۔ گاؤں کے ایک ایک فرد کو پہچانتا تھا اور اُن کے ناموں سے بھی واقف تھا۔

بالکل قریب پہنچ کر اُس نے سلام کیا اور میں نے خوش طبعی کا مظاہرہ

کرتے ہوئے سلام کا جواب بھی دیا۔ میرے سامنے دوزانو ہو کر بڑے ادب سے اس نے دست بوسی کی اور پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگا۔ جوان العُمر، جامہ زیب اور خوش شکل تھا۔ کسی اچھے خاندان کا چشم و چراغ معلوم ہوتا تھا۔ میں نے استفسارِ حال کیا تو بولا "یا حضرت، بہت دور سے شہرت سُن کر حاضر ہوا ہوں۔ ذکرِ شریف سُنا تو دل نے کہا۔ چل نُورالحسن اسی دربار میں چل . . . وہیں تیری قسمت کا ستارہ چمک سکتا ہے۔"

"مُدّعا بیان کر؟" میں نے پُر رُعب لہجے میں کہا۔

گڑبڑا کر بولا۔ "یا حضرت، آپ روشن ضمیر ہیں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میرا جذبہ صادق ہے۔ طریقِ مسنونہ پر شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لی اور بولا "کیوں بدبختی نے گھیرا ہے۔"

"یا حضرت، میں نہیں سمجھا۔"

"پہلے اپنے کوائف بیان کر پھر مطلب بھی سمجھ جائے گا۔ کیا تجھے قیس عامری کا انجام یاد نہیں؟"

"وہ ایامِ جاہلیت کی داستان ہے یا حضرت۔"

"چل بیان کر . . ."

"اسی گاؤں کے مکھیا کی بیٹی ہے۔"

"کیا بک رہا ہے۔ تو نے اُسے کیسے دیکھا۔ وہ تو پردہ نشین ہے۔"

"حسن کی شہرت سُنی ہے یا حضرت . . ."

"تو پھر پیام دے، میرے پاس کیوں آیا ہے؟"

"یہی تو دشواری ہے کہ پیام نہیں دیا جا سکتا۔ ہماری خاندانی دشمنی چلی آرہی ہے میں امین پور کے مکھیا کا بیٹا ہوں۔"

"تب پھر کیسے بات بنے گی؟"

"آپ چاہیں تو بن سکتی ہے۔"

"تیرے باپ اور مُکھیا کے درمیان کبھی دوستی نہیں ہو سکتی۔ کیا تیرا باپ مان جائے گا؟"

"آپ دُعا کریں کہ دونوں کے پتھر دل موم ہو جائیں۔"

میں نے اندازہ لگا لیا کہ دونوں کی دشمنی سمجھانے بجھانے سے رفع نہیں ہو سکتی لہٰذا نہایت صفائی سے بولا "خام خیالی ہے۔ تیرا کام نہیں ہو سکتا۔ اب کسی اور کے حسُن کی شہرت سُن اور عاشق ہو جا۔"

"یہ کیا فرمایا آپ نے . . . ؟"

"درست کہا ہے۔ میں نے دنیا کسی ایک پر ختم نہیں ہو جاتی۔ بحیثیت مسلمان تجھے حق حاصل ہے کہ کم از کم چار عدد کے حسن کا شہرہ سنے اور سر دھنے . . . ."

وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے میری صورت تک رہا تھا۔ پھر ورطۂ حیرت سے نکلا اور یوں گویا ہوا "یا حضرت، مجھے اجازت مرحمت فرمائیے کہ کچھ دنوں آپ کی خدمت میں حاضر رہوں۔"

"ابھی یہاں قیام کا انتظام نہیں ہو سکتا۔" میں نے جواب دیا۔

"میں صرف چند روز کی حاضری کی اجازت چاہتا ہوں۔ قیام کہیں اور کر لوں گا۔"

"کیا مُکھیا تجھے پہچانتا ہے؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے تک کے روادار نہیں ہیں۔ پھر پہچانیں گے کیسے؟"

"اور تُو ایسے کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہے؟"

"دل کے ہاتھوں مجبور ہوں، یا حضرت؟"

اس خنّاس کے بارے میں کوئی کیا کر سکتا تھا، محض حسُن کی شہرت سُن کر یہ سعادت اطوار دل دے بیٹھے تھے اور خاندانی دشمنی کا یہ عالم کہ ایک دوسرے کی صورت تک دیکھنے کے روادار نہیں۔ میں نے سکوت اختیار کر لیا اور حسبِ عادت آنکھیں بند کر کے جھومنے لگا سوچا اس طرح کچھ دیر بعد ٹل جائے گا۔

لیکن وہ تھوڑی دیر بعد کھنکار کر بولا "یا حضرت، کیا میں مایوس ہو جاؤں؟"

میں نے آنکھیں کھولیں اور اُسے قہر آلود نظروں سے دیکھتا ہوا بولا "کیا میرا اتنا کہہ دینا کافی نہیں ہے کہ اب اور کسی کے حسُن کی شہرت سُن۔"

"اس میں کامیابی ہو جائے گی؟" اس نے چہک کر پوچھا۔

"دفع ہو جاؤ۔" میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "مُکھیا کے کان میں بھنک بھی پڑ گئی تو یہاں سے زندہ واپس نہیں جائے گا۔"

"مرنے مارنے سے تو میں ڈرتا نہیں۔"

"اگر آسمانی قہر کی بجلی گر پڑے تو . . . ؟"

"ایسا نہ فرمائیے۔" وہ گھگھیا کر بولا۔

"بس چلا جا . . . ." میں نے دہاڑ کر کہا۔ "ورنہ غارت ہو جائے گا۔"

وہ اُٹھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ مجھے تو دیوانہ ہی معلوم ہوتا تھا، بھلا محض کسی کے حسُن کی شہرت سن کر عاشق ہو جانا نہ سمجھ میں آنے والی بات ہے قصّے کہانیوں میں تو سبھی کچھ ہوتا ہے لیکن ایسا کبھی نہ دیکھا اور نہ سُنا۔

دوپہر کے کھانے سے قبل ہی نسترن واپس آگئی، لیکن مجھے اس پر حیرت تھی کہ معمول کے مطابق ابھی تک گاؤں والے کیوں نہیں آئے تھے۔ میں نے نسترن بالو

سے بھی حیرت کا اظہار کیا۔ ہنس کر بولی "میں نے روک دیا ہے۔"

"کیوں؟ کیوں روک دیا ہے؟"

"اکٹھے شام ہی کو آئیں گے۔ میں نے انہیں ہفتہ سالگرہ کی اطلاع دے دی ہے۔ اُس کی تیاریوں میں لگ گئے ہیں۔"

"تو آخر مجھے تماشا بنا دینے پر کیوں تل گئی ہے۔"

"اُن کا جی بھی بہلے گا اور تمہارا بھی اور اب یہاں محفل سماع بھی ہوا کرے گی۔ میں نے آج سے اجازت دے دی ہے۔"

"تیری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔"

"ارے کیا تمہیں یہ خشک خشک سی زندگی پسند ہے؟"

"مجھے تو آج کل زندگی ہی پسند نہیں ہے۔"

"مرنے بھی نہیں دوں گی، سمجھے تم" وہ مجھے گھونسہ دکھا کر بولی۔

"اچھا، صرف یہ بتا دو کہ یہ ہفتہ سالگرہ کیا بلا ہے؟"

"جشن جشن اور صرف جشن۔ عورتیں گاتی بجاتی ہوئی تمہارے لئے اُبٹن لائیں گی اور بڑے پیار سے تمہارے چہرے پر ملیں گی۔"

"ن۔ ۔ ۔ نامحرم عورتیں" میں ہکلا کر رہ گیا اور میری سانس پھولنے لگی۔

"ہوش کی دوا کرو، ابھی تمہاری عمر ہی کیا کہ عورتیں نامحرم ہو جائیں گی۔ ابھی تو تمہارے مُنہ سے دُودھ کی بُو آتی ہے۔"

"دیکھو نسترن بانو! مجھے غصہ نہ دلاؤ۔"

"پوری بات سُنو، میں اُس روایت کی بنیاد ڈالنے جا رہی ہوں، جو تمہارے بعد بھی جاری رہے گی۔ اُن ہی تاریخوں میں تمہارا اُبٹن اٹھا کرے گا عورتیں اُبٹن لے کر گاتی بجاتی ہوئی تمہارے مزار پر آیا کریں گی اور مزار پر

اُبٹن مل کر اُسے غسل دیا جایا کرے گا۔"

"اور تم جہنم میں اُلٹی لٹکی فریاد کیا کرو گی۔" میں نے جل کر کہا۔

"میرا کچھ بھی ہو۔ میں تو تمہیں مرنے کے بعد بھی شاندار دیکھنا چاہتی ہوں۔ خیر۔ ۔ ۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ اب تمہیں ہفتے بھر تک مُرغن غذائیں بھی ملیں گی اور آٹھویں دن ارنڈی کے تیل کا جُلاب۔"

"کیا بکواس ہے۔"

"مُرغن غذاؤں کے اثرات زائل کرنے کے لئے جُلاب ضروری ہوگا اور نویں دن سے پھر وہی پتلی مونگ کی دال اور خشک روٹیاں۔"

"نہیں، اب میں اِسے قبول کرنے پر تیار نہیں۔"

"یہ بے حد ضروری ہے ورنہ مُرغن غذائیں تمہیں موٹا کر دیں گی۔ توند نکل آئے گی اور تم ولی اللہ کی بجائے کسی یتیم خانے کے منتظم معلوم ہونے لگو گے۔ لوگ یقین نہیں کریں گے کہ تم عشقِ الٰہی میں مبتلا ہو۔ موٹاپے کی حالت میں صرف پیٹ کے سُتے لگو گے۔"

"اچھا تو اسی لئے تو مجھے رُوکھی سوکھی کھلواتی رہتی ہے۔"

"اور کیا؟" وہ چمکار کر بولی "ورنہ میں تمہاری دشمن تو نہیں۔"

"اب یہ بتا کہ اتنے دنوں میں تُو نے کتنی کمائی کر لی ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ میں تو یہ سب کچھ فی سبیل اللہ کر رہی ہوں۔ تمہاری رنڈیوں کا سہارا ہو گیا ہے اور گاؤں والے ثواب کما رہے ہیں۔"

"ہم بدمعاشوں کے پیٹ بھر کر ثواب کما رہے ہیں۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔

"تم تو حلال کو بھی حرام کر لیتے ہو۔ تمہارے مُنہ کون لگے۔ چلو، بیٹھو ایک

ہفتہ ضرور منایا جائے گا۔"

"تو کیا ہفتے بھر تک اُبٹن مَلا جائے گا؟" میں نے مُردہ سی آواز میں پوچھا۔

"میں خوب سمجھتی ہوں۔" ہنس کر بولی۔ "سوچ سوچ کر مزہ آ رہا ہوگا۔"

"خدا سے ڈر نسترن بانو۔" میں نے جھینپ کر کہا۔

"تم سے زیادہ ڈرتی ہوں۔"

اور پھر واقعی میں نے جب اپنے ذہن کو ٹٹولا تو پتہ چلا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ عورتوں کے اُبٹن ملنے کا تصور لذت انگیز تھا۔ آخر یہ اسے سوجھی کیا تھی ابتدا میں تو جب عورتوں نے میرا ہاتھ چُومنا چاہا تھا تو ہائے ہاں کر کے دوڑی تھی اور انہیں اس سے باز رکھا تھا۔ ڈرا دیا تھا کہ ہاتھ بھی لگایا تو جل کر بھسم ہو جائیں گی۔ پھر اب یہ کیا انقلاب؟ جلال کو جمال میں تبدیل کرنے کی ضرورت تھی اور پھر ہفتہ بھر کے لئے کیوں؟

شام ہوتے ہوتے پیچ بیچ گانے بجانے کی آوازیں جنگل میں گونجنے لگیں اور پھر عورتوں اور مَردوں کا وہ مشترکہ جلوس دکھائی دیا، جو مزار شریف کی طرف بڑھا آ رہا تھا۔

"آنکھیں کھولو اور مسکرانا شروع کر دو۔" نسترن بانو مجھے جھنجھوڑ کر بولی۔

"میاں جی، میں مُکھیا غلام رسول ہوں۔ میاں جی میں فلاں ہوں۔ . . اور میں "خوش باش عمر دراز" کی گردان کرتا رہا۔ اس کے بعد مرد پیچھے ہٹ گئے اور عورتیں آگے بڑھیں اور میرے چہرے پر باری باری سے اُبٹن لگانا شروع کیا۔ پھر حالت یہ ہوئی کہ صرف آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں، چہرے پر کم از کم ایک انگل دبیز تہہ اُبٹن کی ضرور رہی ہوگی۔ پھر عورتیں بھی پیچھے

ہٹ گئیں اور نسترن بانو آگے بڑھی۔ اب جو اُس نے میرے چہرے پر اُبٹن کی رگڑائی شروع کی ہے تو خدا یاد آ گیا۔ داڑھی کے سارے بال اُبٹن کی تِیّوں کے ساتھ چہرے سے اُتر گئے اور تکلیف کی شدت سے میری آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ کراہوں اور چیخوں کو میں نے نہ جانے کیسے روکا تھا۔

اسی دوران میں میری نظر اس نوجوان پر پڑی جو صبح ہی صبح اپنی داستانِ عشق مجھے سنانے آیا تھا۔ وہ دور کھڑا خاموشی سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میرے چہرے کی رگڑائی ہو رہی تھی اور عورتیں ڈھولک بجا بجا کر کوئی گیت گا رہی تھیں، جس کے بول میرے پلّے نہیں پڑے تھے۔ پڑتے بھی تو کیا۔ تکلیف کے مارے ذہنی حالت ایسی نہیں تھی کہ میں اس سے محظوظ ہو سکتا۔

بہرحال، اس مرحلے سے گزرنے کے بعد میرا منہ عرقِ گلاب سے دُھلایا گیا اور پھر جو اضافی جلن شروع ہوئی ہے چہرے پر، تو جان ہی نکل کر رہ گئی۔

قصّہ کوتاہ جب میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ داڑھی، مونچھ کی کون کہے، بھنویں تک غائب ہو گئی تھیں۔ دوسرے دن کو کیسا ہونق لگ رہا ہوں گا۔ یہ خیال آتے ہی اپنی بے بسی پر دھاڑیں مار مار کر رونے کو جی چاہنے لگا۔ نسترن بانو ہنس رہی تھی، قہقہے لگا رہی تھی اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس کا منہ کچل کر رکھ دوں۔

کیسا جشن اور کہاں کی تفریح، البتہ گاؤں والے بے حد خوش نظر آ رہے تھے۔ خدا جانے مجھے تفریح کا باعث سمجھ رہے یا کوئی اور بات تھی میرا دھیان پھر اُسی نوجوان کی طرف گیا لیکن اب وہ اس مجمعے میں نہیں تھا اور پھر رات ہوتے ہوتے مجھے ہلکا سا بخار ہو گیا۔ غصّہ، جھنجھلاہٹ، تکلیف کی شدت ان سارے عوامل نے میری حالت غیر کر دی تھی۔

سب کے رخصت ہوجانے کے بعد وہ شیطان کی خالہ بولی ۔" میرا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ ویسے داڑھی مونڈتے تو فقیر کی شان کو بٹہ لگتا اب اس طرح خاصی گھنی اور گنجان داڑھی نکل آئے گی۔ اُس داڑھی میں یتیم یتیم سے لگتے تھے۔"

"رحم کر میرے حال پر پیچھا چھوڑ۔" میں کراہا۔

"ابھی تو کچھ دن تک یہی ہوگا۔"

"یعنی اسی طرح اُبٹن کی رگڑائی ہوگی۔"

"اور کیا۔ نہیں تو گنجان داڑھی کیسے نکلے گی؟"

"میں کسی کنوئیں میں چھلانگ لگا دوں گا۔"

"بڑے نکھوڑ دلے اور بزدل ہو۔"

میں خاموش ہو رہا اور وہ کھا پی کر لیٹ گئی۔ میں نے تو سرے ہی سے کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ بڑی مشکل سے خود پر قابو پانے میں کامیاب ہوا۔ اِدھر اُدھر کی دو چار باتیں کرنے کے بعد میں نے اسے اجنبی نوجوان کے بارے میں بتایا جو صبح کو میرا دماغ چاٹتا رہا تھا۔

بوکھلا کر اُٹھ بیٹھی اور مجھے گھورتی ہوئی بولی "تم نے اس سے اتنی باتیں کیوں کی تھیں؟"

"تم ہی تو کہہ گئی تھیں کہ اب باتیں کرنا شروع کر دو۔" میں نے جواب دیا۔

"اگر وہ تمہارے لئے اجنبی تھا تو تمہیں اپنی زبان بند ہی رکھنی چاہیئے تھی، کہیں وہ کوئی سرکاری کھوجی نہ ہو۔"

اس نئے خیال پر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ پیٹ دباتے بیٹھی سوچتی

اور طرح طرح کے منہ بناتی رہی پھر اُٹھ کر لوٹے میں جلدی سے پانی اُنڈیلا اور اندھیرے میں باہر نکل گئی۔ میں نے تو اس طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ کہیں واقعی سرکاری کھوجی نہ رہا ہو۔ اور پھر مجھے بھی لوٹا بھر پانی کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔

نسترن بانو واپس آئی تو میں نے لوٹا سنبھالا۔ عجیب سی اینٹھن پیٹ میں شروع ہوگئی۔ آج مہینوں کے بعد اچھی غذا نصیب ہوئی تھی تو یہ افتاد پڑ گئی۔ بہر حال کچھ دیر بعد ایسا محسوس ہونے لگا جیسے زندگی بھر کا کھایا پیا آج ہی نکل جائے گا۔ اس بدبخت کی بھی یہی کیفیت تھی۔

"ہائے ابوالحسن یہ کیا ہوگیا۔ اُس نے اپنا نام کیا بتایا تھا۔" وہ پیٹ پکڑ کر کراہتی ہوئی بولی۔

"شاید لوز الحسن۔ ۔ ۔"

"تم مانو یا نہ مانو۔ وہ کوئی سرکاری کھوجی ہی تھا۔"

"چپ چاپ لیٹ جاؤ، دیکھا جائے گا۔" میں نے جی کڑا کر کے کہا۔ پھر اچانک ایک بات یاد آئی اور میں اُٹھ بیٹھا۔ وہ مجھے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہی۔

"وہ انگشتریاں کہاں ہیں جو تم نے رجب خان کے ہاتھوں سے اتاری تھیں۔" میں نے سوال کیا۔

"کک۔ ۔ ۔ کیوں۔ ۔ ۔ میرے پاس ہیں۔"

"انہیں تلف کر دو۔"

"ارے واہ۔ ہزاروں کا مال ہے۔" وہ چونک کر بولی۔

"اور گردن کٹوا دینے کے لئے واضح ترین ثبوت بھی۔"

"میں اُن کی شکل بگاڑ دوں گی۔ جواہرات الگ کر کے انگشتریوں کو پگھلا کر سونے کی ڈلی بنا لوں گی۔"

"جو دل چاہے کرو۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ طبیعت اتنی نڈھال ہوگئی تھی کہ غصہ آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

"تم جب بھی کرو گے بے وقوفی ہی کی باتیں کرو گے۔" اس نے عادت سے مجبور ہو کر میری عزت افزائی کی۔

میں خاموش ہی رہا۔ بولنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ عجیب طرح کی نیند اس رات آئی تھی۔ نہ سونے میں تھا اور نہ جاگنے میں، رہ رہ کے دماغ میں جھماکے سے ہوتے اور ہر کروٹ پر کراہ نکلتی۔

دوسری صبح نسترن ہی نے جگایا تھا اُس کے چہرے پر بھی زردی نظر آئی۔ آنکھوں سے برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ جیسے ہی میں اس کی طرف متوجہ ہوا ماتھے پر بل ڈال کر بولی "آخر تم اتنے بزدل کیوں ہو؟"

مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ خود مری جا رہی تھی۔ رات سے اور مجھے بزدل کہہ رہی تھی۔

"بے حیائی سلامت رہے۔ اُوپر ہنسو گے نہیں تو اور کیا کرو گے؟" بُرا سا منہ بنا کر بولی۔

"یہ صبح ہی صبح کیا شروع کر دی تم نے۔ ہوش میں ہو یا نہیں؟" میں نے طیش میں آکر کہا "میں نے اتنے دنوں کے بعد مرغن غذائیں کھائی تھیں۔ اس لئے میرا تو یہی حشر ہونا تھا۔ لیکن تمہیں کیا ہوا تھا۔ تم رات بھر کیوں دوڑتی رہی تھیں؟"

میری اس بات کا جواب دیئے بغیر اُس نے پھر لوٹا اٹھایا اور رفوچکر ہوگئی۔

میں دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ خود بڑی تیس مار خاں بنتی ہے . . . اور دوسروں کو بزدلی کا الزام دیتی ہے۔

واپسی پر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "میں نے آج تک یہ نہیں پوچھا کہ آخر تم کس نسل سے تعلق رکھتے ہو؟"

"تم کس نسل سے تعلق رکھتی ہو؟" مجھے پھر حرارہ ہوگیا۔

"میں تو مُغل بچی ہوں۔"

"خُدا کا شکر ہے کہ میں مغل بچہ نہیں ہوں، ورنہ تمہاری گردن کب کی اُڑا چکا ہوتا۔"

"پھر آپ کیا چیز ہیں؟" وہ اُوپری ہونٹ بھینچ کر بولی۔

"نسلاً عرب ہوں اور عرب عورتوں کے نخرے برداشت کرنے کے سلسلے میں ساری دُنیا میں شہرت رکھتے ہیں۔"

"تبھی اُونٹ کی مینگنی کی سی شکل نکل آتی ہے۔"

دل کو دھچکا سا لگا۔ یقیناً اونٹ کی مینگنی ہی کی سی شکل نکل آتی ہوگی کیونکہ داڑھی مونچھیں تو بھنوؤں سمیت اُبٹن کی نذر ہوگئی تھیں۔ ٹھنڈی سانس لے کر میں نے چھت کی طرف دیکھا ہی تھا کہ تڑ سے بولی "یہ اُونٹ ہی کی طرح مُنہ کیوں اٹھا رہے ہو؟"

"تمہاری مغفرت کے لئے دُعا کر رہا ہوں۔"

"اپنی خیریت مناؤ۔ سیدھے جہنم میں جاؤ گے۔"

"گویا دوسری دنیا میں بھی تم سے چھٹکارا ممکن نہ ہوگا۔"

"میں تو تمہاری قبر میں بھی گھس جاؤں گی۔"

"آخر کیوں نسترن بانو۔ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ وہ دن یاد

کرو، جب میری ہی وجہ سے تم اپنے شوہر سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہوئی تھیں۔"

"میں تو بوتل کی جن ہوں۔" وہ ہنس کر بولی۔

"ہاں، تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔"

"کیا تمہیں یہ عیش گراں گزرتا ہے؟"

"میں ایک دھوکے باز کی حیثیت سے نہیں مرنا چاہتا۔"

"پتہ نہیں کتنے مر گئے اور آج تک ان کی پوجا ہو رہی ہے۔ بے وقوف آدمی، اگر فریب کسی پر کھل جائے تبھی فریب کہلاتا ہے ورنہ حقیقت ہی حقیقت ہے۔"

"تو کس درس گاہ کی فارغ التحصیل ہے نسترن بانو۔"

"مکتب الشیاطین کی۔" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی۔

رات بہت بری حالت تھی لیکن اس وقت خوب چہک رہی تھی۔ عجیب حال تھا اس کا بھی۔ ہر ڈرا دینے والے معاملے میں پہلے بہت بری طرح سہم جاتی تھی، لیکن پھر آہستہ آہستہ اس انداز میں خود پر قابو پاتی تھی کہ یقین نہیں آتا تھا میں نے کہا۔

"کچھ سوچا۔۔۔؟"

"کس بارے میں؟" اس نے سوال کیا۔

"جس کے سلسلے میں رات سے پریشان ہو۔"

"اونہہ۔۔۔ اگر سرکاری کھوجی ہی ہوا تو مار کر کہیں دبا دیں گے۔"

"تم مار کر دبا دو گی؟"

"ہم، تم مارو گے۔" وہ آنکھیں نکال کر بولی۔ "اگر بزدلی دکھاؤ گے تو

خود تمہیں ذلت کی موت نصیب ہوگی۔"

اُس کے تیور دیکھ کر دل دہل گیا۔ وہ بے حد سنجیدہ نظر آ رہی تھی اور اس میں بناوٹ کا شائبہ تک نہیں تھا۔

"کیوں بکواس کر رہی ہو۔"

"میں سنجیدہ ہوں ابوالحسن۔ اگر اُسے ہم پر شبہ ہوا ہے تو شبہے کی تصدیق کر لینے سے پہلے وہ اس معاملے کو اپنی ذات سے آگے نہیں بڑھاتے گا۔"

"اچھا تو پھر۔۔۔"

"شبہے کی تصدیق ہونے سے قبل ہی اسے ختم کر دیا جائے۔"

بات معقول تھی لیکن کم از کم میں تو کسی کو قتل نہیں کر سکتا تھا۔ میں ابوالحسن اس کا بیٹا جو اپنی زوجہ کے ڈر سے مفقود الخبر ہو گیا تھا۔ کسی سے تیز کلامی کی جرأت تو رکھتا نہیں تھا، چہ جائیکہ کسی کو قتل کر دیتا۔ خود سُولی پر چڑھ سکتا تھا لیکن کسی کا بال تک بیکا نہ کر سکتا تھا۔

"کیا سوچنے لگے؟" اُس نے ٹھوکا دیا۔

"تم سے چھٹکارا پانے کی جرأت تو ہے نہیں مجھ میں، کسی کو قتل کیا کروں گا؟"

"تم مجھ سے چھٹکارا پا کر دو کوڑی کے بھی نہ رہو گے۔"

میں خاموش ہی رہا وہ مزید کچھ کہنے والی تھی کہ حجرے کے باہر سے آواز آئی۔ "یا پیرِ رُوحانی، اسے رُوحِ نورانی، خادم زیارت کی اجازت چاہتا ہے۔" میں سناٹے میں آ گیا۔ یہ تو اُسی مردود کھوجی کی آواز تھی۔

نسترن بانو نے آنکھوں کے اشارے سے استفسار کیا۔ میں نے آہستہ سے کہا "وہی معلوم ہوتا ہے۔"

"حاضری کی اجازت دے دو اور نسترن بانو کو دیکھ کر نظریں نیچی کر لیں۔ پھر تیزی سے میری طرف بڑھا اور قدموں پر سر رکھ دیا۔ اس وقت اس نے فقیرانہ وضع اختیار کر رکھی تھی۔ گیرو سے رنگ کی کفنی پہن کر آیا تھا۔ مجھے ہنسی آتے آتے رہ گئی کیوں کہ اُس نے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا تھا۔ میں نے نسترن بانو کی طرف دیکھا۔ وہ بھی متحیرانہ انداز میں اس کی جانب نگراں تھی۔

جب وہ خوب سا رو چکا تو بولا "یا حضرت مجھے معاف کر دیجیے"

"کس بات کی معافی طلب کر رہا ہے؟"

"آپ واقفِ رازہائے پنہاں ہیں"

"بکواس بند کر۔ کفر کے کلمات زبان سے نہ نکال۔ عالم الغیوب اس نیلی چھتری والے کے علاوہ اور کوئی نہیں"

"میں نور الحسن نہیں ہوں" وہ میرے قدموں سے سر اٹھائے بغیر گڑگڑایا اور نسترن بانو ہونٹ بھینچ کر سر ہلانے لگی۔

"تو کوئی بھی ہو ہمیں اس سے کیا سروکار۔۔۔"

"میری کہانی بہت لمبی ہے، یا حضرت!"

"مختصر کر کے جلدی سے سنا دے کہ میری زوجہ کہانیاں بہت شوق سے سنتی ہے"

نسترن بانو نے مجھے آنکھیں دکھائیں اور پھر اُس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ وہ کہہ رہا تھا "میں مُلک بنگال سے حاضر ہوا ہوں۔ حضرت شیخ چھتائی کے آستانے کی جاروب کشی کرتا تھا۔ ایک دن حکم ہوا کہ اب بس کر یہاں جو کچھ ملنا تھا مل چکا اب عازمِ اکبرآباد ہو۔ قصبہ نگوہاں میں شاہ ابوالحسن تیرے منتظر ہیں۔ پس یا حضرت میں نے رختِ سفر باندھا اور آج قدم بوس ہو

رہا ہوں"

"پھر کل والی بکواس کا کیا مطلب تھا؟" میں نے غضبناک ہو کر پوچھا۔

"میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آپ عشقِ مجازی سے عشقِ حقیقی تک پہنچتے ہیں یا براہِ راست پہنچ گئے ہیں"

"اب اس بکواس کا مطلب بھی بتا"

"دریدہ دہنی کی معافی چاہتے ہوئے عرض کر دوں گا کہ بسا اوقات کسی کمتر درجے کے آدمی کو کسی دولت مند کی بیٹی سے عشق ہو جاتا ہے۔ برسوں اُس کے چکر میں سرگرداں رہتا ہے۔ جب وہ نہیں ملتی تو کھٹ سے معشوقِ حقیقی سے رجوع لاتا ہے اور ہمہ اوست کا دَم بھرنے لگتا ہے"

نسترن بانو نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر میری طرف دیکھا۔

"میں پوچھ رہا ہوں کہ تو نے اپنے عشق کی جھوٹی داستان کیوں سنائی تھی؟" میں نے کڑک کر پوچھا۔

"بس یہی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کہیں آپ بھی تو اِسی طرح اس منصب پر نہیں فائز ہوتے"

"بھلا تجھے اس سے کیا سروکار"

"میں براہِ راست والا پیر چاہتا ہوں۔ عورت کے وسیلے سے خدا تک پہنچنے والے مجھے پسند نہیں ہیں"

نسترن بانو نے پھر ہونٹ بھینچ کر سر کو جنبش دی اور پہلی بار بولی "تو تم آگئے۔۔۔"

"جی مائی صاحبہ" وہ یک لخت اُچھل پڑا۔

"چپ رہ بدبخت" نسترن کڑک کر بولی "کیا میری عمر مائی صاحبہ کہلانے

کی ہے۔ بی بی صاحبہ کہہ۔"

"معافی چاہتا ہوں، بی بی صاحبہ" وہ گڑگڑایا۔

"اپنا صحیح نام بتا۔"

"فیض الحسن عُرف مِٹھو میاں۔"

"یہی نام بتایا تھا شیخ چھتائی شاہ نے۔" وہ سر ہلا کر بولی اور میں حیرت سے اس کی شکل تکنے لگا۔ مجھے فیض الحسن عُرف مِٹھو میاں کے چہرے پر بھی حیرت کے آثار دکھائی دیتے تھے۔

"ہاں ہاں۔ نسترن بانو سر ہلا کر بولی۔" مجھے خواب میں بشارت ہوئی تھی یہ مِٹھو میاں ہی ہیں۔ خوش آمدید مِٹھو میاں۔۔۔ مُرشد تمہیں تعلیم دیں گے۔ حضرت شیخ چھتائی نے عالمِ رویا میں فرمایا تھا کہ مجھے مِٹھو میاں پر فخر ہے، اس نے اپنی چھوٹی سی عمر میں سلوک کی ساری منزلیں طے کی ہیں کہ مجھے اس کے روبرو شرمندگی محسوس ہوتی ہے، اس لئے میں اسے شاہ ابوالحسن کی خدمت میں روانہ کر رہا ہوں۔"

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔ کیا سچ مچ میرے ہاتھوں سے اُسے قتل کرائے گی۔ ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ میرے جسم سے پھُوٹنے لگا۔

اُدھر فیض الحسن بھی شاید دریائے حیرت میں غوطہ زن تھا کہ اس کے منہ سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی، نسترن بانو کو ٹُکر ٹُکر دیکھے جا رہا تھا۔ نسترن بولی۔ اور حضرت شیخ چھتائی نے یہ بھی فرمایا تھا کہ عزیزی فیض الحسن دُشوار ترین چلّے کاٹنے کا شائق ہے اس لئے آپ لوگ بددل نہ ہوں۔ اُسے چلّے کاٹنے دیں۔"

"جی ہاں، جی ہاں۔" فیض الحسن بوکھلائے ہوئے انداز میں بولا۔

"تو ہم، تمہیں چلّے کاٹنے دیں گے اور اپنے طور پر تعلیم بھی دیں گے۔"

"میرے پاس الفاظ نہیں ہیں کہ شکریہ ادا کر سکوں۔" فیض الحسن نے کہا۔

اِتنے میں گاؤں والے ناشتہ لے آئے اور انہوں نے بھی نو وارد گیردے بستر والے قلندر کو حیرت سے دیکھا لیکن کچھ بولے نہیں۔

فیض الحسن ناشتے میں ہمارا شریک ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں اُسے چُپ لگ گئی تھی اور آنکھیں پُرتفکر نظر آ رہی تھیں۔

نسترن بانو ناشتے کے بعد حسبِ معمول گاؤں چلی گئی اور میں نے مراقبے کی ٹھانی۔ نسترن جو شوشا چھوڑ گئی تھی، اس کے سلسلے میں مزید گفتگو سے بچنا چاہتا تھا۔ فیض الحسن اگر پوچھ بیٹھتا کہ حضرت شیخ چھتائی نسترن بانو کے خواب میں کیوں آتے تھے۔ براہِ راست میرے ہی خواب میں کیوں نہیں آتے تو کیا جواب دیتا۔۔۔ اگر وہ سچ مچ سرکاری کھوجی ہی ہے تو نسترن بانو کے اس کالے جھوٹ کو کس زاویے سے دیکھے گا۔

دفعتہً اُس نے میرے مُراقبے کی پروا کئے بغیر کہا۔ "یا حضرت، مجھے مائی صاحبہ سے ڈر لگ رہا ہے۔"

بڑی مشکل سے میں نے اپنی ہنسی روکی تھی اور اُسے قہر آلود نظروں سے گھورنے لگا تھا۔

"میں جھُوٹ نہیں کہہ رہا، یا حضرت۔"

"کیوں ڈرتا ہے؟"

"پتہ نہیں کیوں؟"

میں زیادہ پوچھ گچھ سے احتراز کرنا چاہتا تھا کیوں کہ ذہن میں تو یہ بات جڑ پکڑنے لگی تھی کہ وہ کوئی سرکاری کھوجی ہے اور رجب خان کی تلاش میں ہے۔

میں نے پھر آنکھیں بند کیں اور جھومنا شروع کر دیا۔ اب تو عادت سی پڑ گئی تھی، جھومنے کی بے مقصد بھی جھومنے لگتا تھا۔

"یا حضرت کچھ تعلیم فرمائیے،" فیض الحسن نے کچھ دیر بعد مراقبے میں خلل ڈالنے کی کوشش کی۔

"اِلف سے اُلّو۔ ۔" میں آنکھیں کھول کر غرّایا۔

"جی۔ ۔ ۔" وہ اُچھل پڑا۔

"اس گوشے میں چلا جا" میں نے ایک جانب ہاتھ اٹھا کر کہا" اور دیوار کی طرف منہ کر کے بیٹھ جا اور رٹتا رہ الف سے اُلّو۔ ۔ ۔"

"لل۔ ۔ ۔ لیکن۔ ۔ ۔ یا حضرت !"

"کیا تو اِسے عِلم نہیں سمجھتا؟" میں نے آنکھیں نکالیں۔

"یہ بات نہیں ہے؟" وہ گڑ بڑا کر بولا۔

"پھر کیا بات ہے تو یہاں مولوی فاضل بننے نہیں آیا۔ باطن کی اصلاح کی جاتی ہے یہاں۔ الف سے اُلّو رٹنے میں تیری اَنا کو ٹھیس لگے گی کیوں؟ ہے نا یہی بات ؟"

"یہی سمجھ لیجئے۔"

"بس تو پھر اس اَنا کو فنا کر دے کہ راہ سلوک کا پہلا مرحلہ یہی ہے۔ اس کے بعد الف سے اللہ اور بے سے بندہ۔"

"معافی چاہتا ہوں یا حضرت۔ پہلے بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔" اس نے کہا اور حسبِ ہدایت اُسی گوشے میں جا بیٹھا۔

"بہ آوازِ بلند۔" میں نے للکار کر کہا۔

اور وہ زور زور سے الف سے اُلّو کی ہانک لگانے لگا۔ تھوڑی ہی دیر

بعد مجھے اُس سے الجھن محسوس ہونے لگی اور میں نے ڈپٹ کر کہا۔ "بس کر اور اِدھر آ۔"

اس نے تعمیل میں بڑی پھرتی دکھائی اور میرے قریب ہی دو زانو آ بیٹھا۔

"تو چِلّہ کشی بھی کرتا رہا ہے ؟" میں نے پوچھا۔

"جج۔ ۔ ۔ جی ہاں۔ ۔ ۔"

"کس قسم کی۔ ۔ ۔"

"وہ دیکھئے۔ ۔ ۔ دراصل مائی صاحبہ کو خواب ٹھیک طرح سے یاد نہیں رہا۔ حضرت شیخ چھتانی نے حُقّہ کشی کہا ہو۔"

"یہ کیا چیز ہوتی ہے ؟"

"یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن اَمرِ واقعی یہ ہے کہ میں حُقّے کا کش لیتا تھا اور دھواں حضرت شیخ کے منہ سے نکلتا تھا۔"

"یہ کیوں نہیں کہتا کہ حُقّہ کشی شیخ کی کرامت تھی۔"

"جی۔ جی۔ بجا فرمایا۔ ۔ ۔ تو مطلب یہ کہ شیخ نے حُقّہ کشی فرمایا ہو گا۔ مائی صاحبہ چِلّہ کشی سمجھیں۔"

"بکواس مت کر۔ ہم میں کوئی خوبی ہو یا نہ ہو لیکن ہماری نزدگی درجۂ کمال کو پہنچی ہوتی ہے۔"

"بے شک۔ بے شک، اس حقیر پُر تقصیر نے بھی یہی محسوس کیا تھا۔"

میں نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور حسبِ توفیق جھومنا شروع کر دیا۔

لیکن وہ کب چُپکا بیٹھنے والا تھا۔ جلد ہی کھنکار کر بولا۔ "یا حضرت ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

"اتنی جلدی کچھ بھی سمجھ میں نہیں آسکے گا۔" میں نے آنکھیں کھولے بغیر جواب دیا۔

"کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے۔"

"پوچھ۔۔۔ کیا پوچھنا ہے؟"

"وہ اُبٹن والا معاملہ یا حضرت۔"

میں نے قدرے تبسم کیا اور آنکھیں کھول کر بولا۔ "یہ بہت پیچیدہ مسئلہ ہے۔ ابھی تیری سمجھ میں نہیں آئے گا۔"

"لیکن میں کل سے اسی میں الجھا ہوا ہوں۔"

"اچھا تو سُن۔ سُن نہیں بلکہ غور سے میری طرف دیکھ۔"

"اس نے بڑی سعادت مندی سے تعمیل شروع کر دی۔ ٹکٹکی لگائے مجھے دیکھتا رہا۔

"دیکھ چکا۔۔۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ یا حضرت دیکھ چکا۔"

"میں کیسا لگ رہا ہوں؟"

"ہی ہی ہی ہی۔۔۔ بس کیا عرض کروں۔۔۔"

"مضحکہ خیز لگ رہا ہوں؟"

"اپنی زبان کاٹ کر پھینک دوں اگر ایسا کوئی لفظ اُس سے نکل جائے۔" وہ سنبھل کر بولا۔

"پھر تجھے اس سوال پر ہنسی کیوں آئی تھی؟"

"اظہارِ بے بسی تھا یا حضرت کیوں کہ جواب کے لئے میرے پاس الفاظ نہ تھے۔"

"ہماری زوجہ مادرزاد ولیہ ہے۔ پیدا ہوتے ہی اس نے ذاتی جنائی سے پوچھا تھا۔ یہ تُو نے شُوترکی سی تھوتھنی کیوں بنا رکھی ہے اور وہ بے چاری چیخ

مار کر بے ہوش ہو گئی تھی۔"

"اُف، میرے خدا۔" اُس کی آنکھوں میں خوف کے سائے نظر آئے۔

"پس اے نادان، ہماری صورت پر غور کر اس سے پہلے بھی تو نے ہمیں دیکھا تھا کیا یہ ایسی ہی تھی۔"

"نہیں یا حضرت شکل مبارک بے حد نورانی تھی۔ دل بے اختیار کھنچتا تھا۔"

"اور اَب۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔

کم بخت نے اس سوال پر سکوت اختیار کر کے سچ مچ دِل جلا دیا۔ ویسے بھی وہ جواب ہی کیا دیتا۔ بہر حال میں نے غصہ ضبط کر کے کہا۔ "ہماری زوجہ ہر سال یہ جشن اسی لئے برپا کرتی ہے کہ کہیں ہم اپنی وجاہت پر مغرور نہ ہو جائیں۔ ہر سال ہماری اصلی شکل ہمیں دکھا دیتی ہے۔"

"اللہ رحم کرے۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"ایک ہفتے تک اسی طرح اُبٹن لگتا رہے گا۔"

"پلکیں تو بچا ہی لیجئے گا۔" اس نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"اگر اللہ کو منظور نہ ہوا تو وہ بھی نہیں بچیں گی۔" میں بے بسی سے بولا۔

"تو آپ بھی خائف رہتے ہیں مائی صاحبہ سے۔"

"کیوں نہ رہیں۔ ہماری مُرشد تو وہی ہے، سلوک کی منزلیں تو وہی طے کرا رہی ہے۔"

"لیکن حضرت شیخ چغتائی نے یہ تو نہیں فرمایا تھا۔"

"شیخ چغتائی" میں نے حقارت سے کہا۔ "شیطان بھاگا بھاگا پھرتا ہے ہماری زوجہ سے۔ شیخ چغتائی کیا چیز ہیں۔ اُن کے تصوّر کے بھی پَر جل جائیں گے اگر وہ ادھر کا رُخ کرے۔ دراصل تو ہمارے توسط سے اسی کی شاگردی

میں دیا گیا ہے۔"

وہ بڑی عجیب نظروں سے مجھے دیکھے جا رہا تھا۔ دفعتاً میں نے آنکھیں بند کر لیں، اور جھومنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد "الف سے اُلّو" کی گردان دوبارہ سنائی دی۔ آنکھوں میں دَرّہ کر کے دیکھا۔ وہ پھر اُسی گوشے میں دیوار کی جانب منہ کر کے جا بیٹھا تھا اور پہلا سبق بہت دل لگا کر یاد کرنے لگا تھا۔

میں بڑی مشکل سے اپنے قہقہے کا گلا گھونٹ سکا۔

نسترن بانو دو کھانے کے ساتھ واپس آئی۔ ایک موٹی سی رسی کا لچھا بھی لائی تھی۔ میں نے اشارے سے اُس کا مصرف پوچھا، لیکن وہ آنکھ دکھا کر وہ گئی اور پھر فیض الحسن کو گھورنے لگی جو اب بھی بہ آواز بلند یاد کئے جا رہا تھا اس سے نظر ہٹ کر مجھ پر ٹھہری۔

"وہی پہلا سبق جو تم نے مجھے دیا تھا، برخوردار فیض الحسن کے لئے تجویز کر دیا ہے۔" میں نے وضاحت کی۔

اس نے بُرا سا منہ بنایا اور زور سے بولی "بس کرو۔"

فیض الحسن اس طرح خاموش ہو گیا جیسے دفعتاً اس کی گردن اڑا دی گئی ہو۔

"سیدھے بیٹھو۔"

وہ تیزی سے گھوما اور سر جھکائے بیٹھا رہا۔ میرے پیٹ میں درد شروع ہو گیا تھا۔ بار بار ہنسی روکنا کوئی ہنسی کھیل تو تھا نہیں۔

"میں نے تمہاری آمد کی اطلاع قصبے والوں کو دے دی ہے۔"

فیض الحسن کچھ نہ بولا اور وہ کہتی رہی۔ "شیخ چغتانی نے تمہارے ایک مخصوص چلّے کا ذکر کیا تھا، لہٰذا آج کے جشن کے بعد قصبے والے اس چلّے کا مظاہرہ دیکھیں گے۔"

"میں نہیں سمجھا، بی بی صاحبہ"

"وقت آنے پر سمجھ جاؤ گے۔"

"لیکن میں تو حضرت کو اصل بات بتا چکا ہوں۔"

"کیا بتا چکے ہو؟"

اس نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ شاید مجھ سے متوقع تھا کہ میں اس کی وکالت کروں گا۔

"یہ کہتا ہے کہ تمہارے سننے میں فرق آیا ہوگا۔ حُقّہ کشی کو چلّہ کشی سمجھی ہوگی۔" میں نے کہا۔

"یہ حُقّہ کشی کیا ہوتی ہے؟"

"کرامت، کرامت۔۔۔۔ شیخ چغتانی حُقّے کا کش اِس سے لگواتے تھے اور دھواں اپنے مُنہ سے نکالتے تھے۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔"

"بکواس نہیں ہے، بی بی صاحبہ۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "میرے دادا بگڑ شاہ بھی بہت پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔"

"تب تو اَدھورے تھے۔" نسترن بُرا سا مُنہ بنا کر بولی۔

"میں نہیں سمجھا بی بی صاحبہ۔"

"سنو۔" وہ اُسے گھورتی ہوئی غرائی۔ "میں قصبے والوں سے کہہ چکی ہوں کہ تم چلّہ کشی کے آغاز کا مظاہرہ کرو گے۔"

"مم۔۔۔ مگر۔۔۔ مظاہرہ۔۔۔ کیسے؟"

"اس کی نگہت کرو۔۔۔ وہ اُدھر دستر خوان رکھا ہے، اٹھا کر بچھا دو،

پھر میں تمہیں بتاؤں گی کہ دسترخوان پر کھانا کس طرح لگاتے ہیں "

فدویانہ انداز میں اٹھا اور نسترن بانو کے احکامات کی تعمیل کرنے لگا۔ میرا ذہن رسّی کے لچھے میں اُلجھا ہوا تھا۔ کم از کم تیس چالیس گز لمبی رہی ہو گی۔ کیا فیض الحسن کو پھانسی دینے کا ارادہ رکھتی ہے۔ آخر کیا سوچا ہے اس نے۔

دوپہر کے کھانے کے بعد ہم دونوں قیلولے کے لئے لیٹ گئے تھے اور نسترن بانو نے فیض الحسن کو مزار شریف کی جاروب کشی کے لئے بھیج دیا تھا۔ میں نے رسی کے بارے میں پوچھنا چاہا لیکن وہ کچھ نہ بولی۔ آنکھیں بند کئے پڑی رہی۔

شام کو پھر جشن کا ہنگامہ شروع ہوا۔ اُبٹن کا قصّہ نبٹانے میں جلدی کی گئی تھی۔ اس کے بعد نسترن بانو نے مجمعے کو مخاطب کیا"۔۔۔ ملک بنگال سے ایک بزرگ حضرت شیخ چھتائی نے اپنے شاگرد رشید میاں فیض الحسن کو مُرشد کے حضور برائے تربیت بھیجا ہے۔ یہ فیض الحسن بڑے جفاکش ہیں، ایسے سخت چلّے کھینچتے ہیں کہ فولاد کے آدمی کا پتّہ بھی پانی ہو جاتا ہے "

وہ خاموش ہو گئی اور میں الجھن میں پڑ گیا کہ اب کیا کہے گی، آخر کیا کرنا چاہتی ہے۔

اس نے پھر بولنا شروع کیا "کسی گوشے میں بیٹھ کر سکون سے چلّہ کشی کر لینا اور بات ہے لیکن میاں فیض الحسن کی طرح کسی درخت سے اُلٹے لٹک کر مجاہدہ کرنا اور بات ہے۔ میں نے اب تک نہ کہیں دیکھا اور نہ کہیں سنا لیکن آپ سب دیکھیں گے۔ ہاں بھئی رحمت خان ذرا یہ رسّی سامنے والے درخت کی کسی مضبوط شاخ سے اس طرح باندھ دو کہ اس کے دونوں سرے نیچے لٹکتے رہیں "

میں نے فیض الحسن کی طرف دیکھا، اس کے مُنہ پر ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔ بوکھلا کر ایک ایک کا چہرہ تک رہا تھا لیکن زبان گنگ ہو گئی تھی۔

پھر اس نے میری طرف ملتجیانہ نظروں سے دیکھا لیکن میں کر ہی کیا سکتا تھا تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ سکھیا کا سپاہی رحمت خان رسّی کا لچھا اُٹھا کر درخت کی طرف چل پڑا۔

. . . .

●

نسترن بانو نے فاتحانہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر کیا کرنے والی ہے۔ کیا سچ مچ فیض الحسن کو درخت سے اُلٹا لٹکوا دے گی؟" اگر وہ کوئی سرکاری کھوجی ہی ہے تو اس کے بعد کیا ہوگا . . . کمبخت کو جو سوجھتی ہے، انوکھی ہی سوجھتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر تدبیر اسی چوکھٹے میں پوری بیٹھے جس مقصد کے لئے اُسے اختیار کیا جا رہا ہے پہلے اس نے کہا تھا کہ اگر وہ کوئی سرکاری کھوجی ہی ہے تو اس سے پیچھا چھڑانے کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ اسے چُپکے سے ٹھکانے لگا دیا جائے کسی حد تک معقول تھی یہ تجویز، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی لیکن اس طرح تو وہ اُس کی تشہیر کرنے جا رہی تھی۔ خلقت کا ایک اژدھام اُسے درخت سے اُلٹا ٹنگے دیکھے گا۔ ایک ایک کے ذہن پر نقش ہو جائے گی اُس کی صورت . . . اور پھر اگر وہ اچانک غائب ہو گیا تو بھی کو تشویش ہو جائے گی۔ بعض کو تو کُرید بھی پڑ جائے گی۔

بہرحال میری دانست میں اُس سے اوّل درجے کی احمقانہ حرکت سرزد ہونے جا رہی تھی۔ دفعتاً وہ فیض الحسن کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو میاں فیض الحسن۔ لبادے کو سمیٹو اور کس کر کمر کے گرد باندھ لو؛

ورنہ یہ اُلٹ کر مُنہ پر آجائے گی اور یہ لوگ بحالتِ چلہ کشی تمہاری نورانی صورت نہ دیکھ سکیں گے۔"

فیض الحسن نے پھر بڑی بے بسی سے میری طرف دیکھا اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اپنی عافیت مجھے اسی میں نظر آئی تھی کہ نسترن بانو کے معاملات میں دخل اندازی نہ کروں۔ آنکھیں بند کئے جھومتا رہا۔ ویسے آج کی مالش سے پھر چہرے پر کل ہی کی سی سوزش ہونے لگی تھی لیکن آج برداشت کی قوت میں کسی قدر اضافہ بھی محسوس کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اچانک شورِ تحسین بلند ہوا اور میں نے آنکھیں کھول دیں؛ بیچارہ فیض الحسن درخت سے اُلٹا لٹک رہا تھا۔ دونوں ٹانگیں الگ الگ رسیوں سے بندھی ہوئی تھیں۔ شاید پلکیں جھپکانا ہی بھول گیا تھا۔

نسترن بانو میرے قریب آکر آہستہ سے بولی۔ "کہو تو لوبان کی دُھونی بھی دلوا دوں؟"

"کھانس کھانس کر مر جائے گا۔ اندھا ہو جائے گا۔" میں نے خوفزدہ سی آواز میں کہا۔

"خیر، تم کہتے ہو تو نہیں دلواتی۔"

"تجھے آخر یہ سوجھی کیا؟"

"ذرا مجمع برخاست ہو لینے دو تو بتاؤں۔" اُس نے کہا اور میرے پاس سے ہٹ گئی۔

اور میں سوچنے لگا کہ بتائے گی کیا . . . مجمع ابھی برخواست ہوگا؟ ابھی تو محفلِ سماع منعقد ہوگی . . . ہندوؤں کے بھجن اور کیرتن کی خوب نقل اُتاری ہے . . . بغداد میں ہوتے یہ لوگ تو زندہ دفن کر دیئے جاتے . . . بیٹھے اور

سارنگی پر اللہ اور اس کے رسول کا نام الاپتے ہیں۔ یہ امیر خسرو بھی عجیب چیز تھے، اسلام تک کو مقامی رنگ دینے کی کوشش کر ڈالی تھی۔ ۔ ۔ لیکن عُلمائے کرام کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی اور تو اور محمد تغلق جو شریعت کا بے حد پابند تھا۔ اس کے دور میں اِس بدعت نے رواج پایا۔ اوہ، کہاں کا تغلق کہاں کی بدعت ۔ ۔ ۔ یہ مُردار نسترن بانو کیا کر رہی ہے۔ کیسی مٹّی پلید کی ہے میری۔ اَے میرے باپ، تم کہاں ہو ۔ ۔ مگر تم کیا کرو ۔ ۔ تم بھی تو مادرِ محترم کے مارے ہوتے تھے۔ کاش تم اتنے ڈرپوک نہ ہوتے ۔ ۔ ۔ پتہ نہیں زندہ بھی ہو یا اللہ کو پیارے ہوئے، لیکن میرے سر میں یہ سودا کیوں سمایا کہ تمہاری تلاش میں نکلوں اور اس وبال میں پڑ جاؤں۔

تقریب جاری رہی، لیکن مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی کھنکتے ہوئے قہقہے کانوں میں پڑ رہے تھے، لیکن ان سے محظوظ ہونے کی تاب مجھ میں نہیں رہی تھی ذہن اسی میں الجھا ہوا تھا کہ اَب نسترن بانو کیا کرنے والی ہے۔

خُدا خُدا کر کے یہ ہنگامہ ختم ہوا۔ لوگ رخصت ہونے لگے۔ خاصی رات ہوگئی تھی۔ وہ مشعلیں اٹھاتے ہوئے فیض الحسن کے قریب سے گزُرتے رہے لیکن کوئی اس کے آس پاس رُک نہیں رہا تھا۔ پتہ نہیں اُس بے چارے پر کیا گزُر رہی ہے۔ تھک ہار کر شاید اُس نے بھی اپنی اس حالت کو رُوحانی مشقت کا رنگ دینے کی کوشش شروع کر دی تھی، بالکل بے حس و حرکت لٹکا ہوا تھا یا پھر اتنی اذیت محسوس کی ہو کہ بے ہوش ہی ہوگیا ہو۔ سب چلے گئے صرف مُکھیا اور اس کے دو سپاہی رُک گئے۔

"بی بی صاحب اب ان کا کیا ہوگا؟" مُکھیا نے نسترن بانو سے پوچھا، اس کا اشارہ فیض الحسن کی طرف تھا۔

"ابھی تو مراقبے میں ہے۔" نسترن بانو بولی۔ "آپے میں آکر جو کچھ بھی کہے گا

کریں گے۔"

"تو پھر میں سپاہیوں کو یہیں چھوڑ جاؤں؟"

"ارے نہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے ۔ ۔ ۔ ہم لوگ جانتے ہیں کہ ہمیں کیا کرنا ہے اور پھر یہ روحانی معاملات ہیں، تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گے۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" مُکھیا نے نیازمندانہ انداز میں کہا اور پھر وہ بھی اپنے سپاہیوں سمیت چلا گیا۔

"نسترن بانو کہیں وہ مر ہی نہ جائے۔" میں نے خوفزدہ سے لہجے میں کہا اور وہ بڑی بے دردی سے ہنس پڑی۔ "آخر تو چاہتی کیا ہے؟"

"اُس کی موت" وہ سرد لہجے میں بولی اور میں ہونقوں کی طرح اس کی شکل تکنے لگا۔

"اس طرح نہ دیکھو۔ میں تمہاری طرح اناڑی نہیں ہوں۔"

"تو اناڑی سے بھی بدتر معلوم ہوتی ہے۔" مجھے حرارہ آگیا۔

"وہ کس طرح میاں جی؟"

"تو نے ایک خلقت کو اپنے اس جُرم کا گواہ کیا ہے؟"

"گھاس کھا گئے ہو گیا؟"

"ارے اتنی موٹی سی بات بھی تیری سمجھ میں نہیں آتی۔" میں نے زچ ہو کر کہا۔

"موٹی سی بات تو تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی میاں جی ۔ ۔ ۔ مگر تم تو ہو ہی کودن، تم سے بڑا گھامڑ آج تک میری نظروں سے نہیں گزُرا۔"

"ہاں، میں واقعی گھامڑ تھا کہ اس بُوڑھے کی بلا اپنے سر لگا لی۔"

"بات بات پر اس کا طعنہ مت دیا کرو۔ سمجھے!" وہ آنکھیں نکال کر بولی۔

"میں طعنہ نہیں دے رہا۔ خلوص دل سے اپنے گھامڑ پن کا اعتراف کر رہا ہوں۔ ویسے اسے کبھی نہ بھولا کر تو کس طرح روتی گڑگڑاتی ہوئی قطب قلی خان کی حویلی میں میرے پاس آئی تھی۔"

اس وقت اس کا کیا ذکر" وہ چمک کر بولی۔

"تو جب بھی احسان فراموشی کا ثبوت دے گی، تجھے یاد دلاؤں گا۔ کنیز بن کر رہنے کا وعدہ کیا تھا تو نے . . . . اور اب مالکن بن بیٹھی ہے۔ مجھے اپنی مرضی کا پابند رکھنا چاہتی ہے۔"

"پابند رکھنے کی کوشش نہ کروں تو تم غرق ہو جاؤ۔"

"بس کر یہ بکواس اور مجھے سوچنے دے کہ اس حرکت کا نتیجہ کیا ہوگا۔"

"یہی کہ وہ مر جائے گا۔" تڑ سے جواب دیا۔

"اور ہم چین سے بیٹھے رہیں گے؟"

"بالکل .... ہمارے چین میں کیا فرق پڑے گا۔ خلقت گواہی دے گی کہ وہ اپنی مرضی سے مراقبے کے لئے اُلٹا لٹکا تھا۔ اس کی مرضی کے خلاف ہوتا تو کیا وہ اس وقت احتجاج نہ کرتا جب اُلٹا لٹکایا جا رہا تھا۔"

میں سناٹے میں آ گیا۔ بات پتے کی تھی۔ واقعی اُس نے احتجاج نہیں کیا تھا۔ نسترن بانو کے اعلان کی تردید بھی نہیں کی تھی۔ چپ چاپ اُلٹا لٹک گیا تھا۔ بالکل ایسا ہی معلوم ہوا تھا جیسے بَرضا و رغبت اپنے مجاہدے کا مظاہرہ کرنے جا رہا ہو۔

نسترن بانو مجھے خاموش دیکھ کر ہنس پڑی اور بولی۔ "اگر مر گیا تو اعلان کر دوں گی کہ اس کے مُرشد نے اُسے مُلک بنگالہ سے اسی لئے بھیجا تھا کہ وہ یہاں آ کر رحلت کرے اور شاہ ابوالحسن کے دستِ حق پرست سے دفنا دیا جائے۔"

مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا سر شانے سے اُڑ گیا ہو۔ واقعی خود کو بالکل گھامڑ تسلیم کر لینے کو دل چاہنے لگا۔ اس سے بہتر تدبیر تو اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ سرکاری کھوجی رہا ہو یا کوئی اور، گاؤں والے بہرحال ہمارا ساتھ دیتے کیونکہ سب کچھ ان کی موجودگی میں ہوا تھا اور انہوں نے اسے بہ نظرِ استحسان بھی دیکھا تھا۔

"پھر چپ ہو گئے۔" نسترن بانو نے چھیڑا۔

"کچھ بھی ہو، اس کا خون تو ہماری گردن پر ہوگا۔" میں نے شکست تسلیم نہ کرنے کا تہیہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہوا کرے۔" وہ بے پروائی سے بولی۔

دفعتاً میں چونک پڑا۔ گاؤں کی سمت سے کوئی مشعل لئے اسی طرف دوڑا چلا آ رہا تھا۔

"یہ کون چلا آ رہا ہے۔" میں نے بوکھلا کر اٹھتے ہوئے کہا۔

"بیٹھے رہو، جو بھی ہوگا، ادھر ہی آتے گا۔"

لیکن وہ فیض الحسن کے قریب رُک کر اُسے آوازیں دینے لگا۔

"یہ کون بدبخت ہے؟" نسترن بانو چیخ کر بولی۔ "ہٹ جاؤ ورنہ جل کر بھسم ہو جاؤ گے۔"

"میں مسجد کا امام ہوں، بی بی صاحب۔" مری مری سی آواز آئی۔

"وہاں کیا کر رہے ہو، اِدھر آؤ۔"

"یہ بے ہوش ہو گیا ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ مراقبے میں ہے۔ ہٹو وہاں سے۔"

"کہیں مر نہ جاتے؟"

"تم سے مطلب . . . ؟ تم کون ہوتے ہو ہمارے رُوحانی معاملات میں دخل انداز ہونے والے۔ یہ فیض الحسن عرف مٹھو میاں ہیں۔ ملک بنگال کے بزرگ شیخ چھتانی کے شاگردِ رشید۔"

وہ تیر کی طرح ہماری طرف آیا اور بولا "یہ بات نہیں ہے۔ خدا کے لئے اُسے اُتاریئے، ورنہ سچ مچ مرجائے گا۔"

"امام صاحب ہوش کی دوا کرو۔" نسترن بانو کڑک کر بولی "تمہاری یہ دخل اندازی کسی طرح بھی جائز نہیں، تم ایک مردِ حق کی عبادت میں خلل انداز ہونے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"وہ . . . مم . . . میرا بھانجا ہے . . . بی بی صاحب۔ خُخ خدا کیلئے۔"

وہ ہکلا کر رہ گیا۔

"تمہارا بھانجا ہے . . . ؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"جی ہاں۔ ملک بنگال سے نہیں اکبر آباد سے آیا ہے۔"

"میں سمجھی۔" وہ امام کو گھورتی ہوئی بولی "ہماری آمد سے تمہارے مان دان میں فرق آگیا تھا۔"

"دِ . . . دراصل . . . ؟ وہ پھر ہکلا کر رہ گیا۔

"تو کیا سمجھتا ہے کہ ہم تیرے اس شر سے آگاہ نہیں تھے۔ خاصانِ خدا خدا نہ باشند۔ لیکن زخدا جدا نہ باشند . . . بیوقوف دیکھ وہ اپنی خوشی سے اُلٹا لٹک گیا، گاؤں بھر کے سامنے۔ جس سے جی چاہے جاکر پوچھ لے، اُسے زبردستی نہیں لٹکایا گیا۔"

"مم . . . میں . . . جانتا ہوں، بی بی صاحب . . . . رحم کیجئے مجھ پر . . ."

"ہماری پول کھولنے کی غرض سے تُو نے اپنے بھانجے کو کھوجی بنا کر بھیجا تھا۔ کیا ہم نہیں جانتے کہ تو گاؤں والوں میں ہمارے خلاف باتیں کیا کرتا ہے، ہمیں بہروپیا کہتا ہے اور تُو نے کبھی یہاں حاضری نہیں دی۔"

"میں نادم ہوں، بی بی صاحب . . . مجھے معاف کر دیجئے۔"

"کیا چاہتا ہے ؟"

"اُس کی زندگی . . . وہ بے ہوش ہوگیا ہے۔"

نسترن بانو نے میری طرف دیکھا اور میں نے تھوک نگل کر کہا "ہمارے لئے یہی حکم ہے کہ ہم معاف کر دیں۔"

"تو پھر اُسے اُتارنے میں امام کا ہاتھ بٹاؤ۔"

میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ بڑی دشواری سے فیض الحسن کو اُتارا پھر ٹانگا ٹولی کر کے حجرے میں لے آئے۔ وہ واقعی بے ہوش تھا اور نبض کمزور پڑ گئی تھی۔ نسترن بانو عطر کی ایک پھریری بنالائی اور اس کی ناک کے قریب کرکے بیٹھ گئی۔

"اب تو کیوں بیٹھا ہوا ہے۔" نسترن بانو نے امام سے کہا۔ "اپنا راستہ لے۔"

"اسے ساتھ لے جاؤں گا، بی بی صاحب۔"

"اب یہ دوسری حماقت کرے گا۔"

"میں نہیں سمجھا۔" وہ گڑبڑا کر بولا۔

"گاؤں والوں کو یہ بتائے گا کہ یہ تیرا بہروپیا بھانجا ہے۔ جو ہماری پول کھولنے کے لئے ہم سے مل بیٹھا تھا۔"

"پھر میں کیا کروں ؟"

"دیکھ تُو ہمیں ذلیل کرنا چاہتا تھا لیکن ہمیں تیری عزت عزیز ہے اِسے

یہیں پڑا رہنے دے۔ گاؤں میں اسے کوئی بھی تیرے بھانجے کی حیثیت سے نہیں پہچانتا۔ ۔ ۔ ورنہ ہمیں ضرور بتاتا۔"

"جی ہاں۔ کوئی بھی نہیں پہچانتا۔"

"بس تو پھر دو چار دن کے بعد اُسے چلتا کر دیں گے۔ کوئی پوچھے گا تو کہہ دیں گے، مرد قلندر تھا کسی اور طرف نکل گیا ہوگا۔"

"جی ہاں۔ ۔ ۔ یہ بالکل ٹھیک ہے۔ میری عقل خبط ہوگئی تھی۔ واقعی آپ لوگ اہل اللہ ہیں، مجھے معاف کر دیجئے۔ اجازت ہو تو قدموں پہ سر رکھ دوں۔"

"نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔" نسترن بانو نے بے نیازی سے کہا۔

"بس اتنا کیجیو کہ اب ہوش میں رہیو۔ اپنے دل کو کینے سے بچائیو ورنہ جہنم کا دہانہ تو کھلا ہی ہوا ہے۔"

"میرے حق میں دعا فرمائیے۔ میں بہت گنہگار ہوں۔" وہ اپنے دونوں کان پکڑ کر بولا۔ "زندگی بھر آپ دونوں کا خادم رہوں گا۔"

"دل صاف رکھ، اس کے علاوہ اور کوئی نصیحت نہیں کروں گی۔"

"مجھے مُرید کر لیجئے، میاں صاحب۔" وہ میری طرف دیکھ کر گڑگڑایا۔

"پہلے خود کو اس کا اہل ثابت کرنے کی کوشش کر۔ پھر تیری یہ خواہش بھی پوری کر دی جائے گی۔" نسترن بانو نے کہا۔

وہ دم بخود بیٹھا رہا۔ میری نظر فیض الحسن کے چہرے پر تھی۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹے جنبش کرنے لگے تھے اور رہ رہ کر ناک بھی سکوڑ رہا تھا۔

"اِس کے ہوش میں آنے سے پہلے جا۔" نسترن نے امام صاحب سے کہا۔ "اور دیکھ نہ اس سے ملنے کی کوشش کیجیو اور نہ شناسائی ظاہر کرنے کی۔ جب تک

یہ یہاں رہے، اِدھر کا رخ بھی نہ کیجیو۔"

"آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی، بی بی صاحب" وہ اٹھتا ہوا اور جھک جھک کر سلام کرتا ہوا رخصت ہوگیا۔

اُس کے دُور نکل جانے کے بعد میں نے کچھ کہنا چاہا تھا، لیکن نسترن بانو نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ۔ ۔ فیض الحسن آنکھیں کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یک بیک اُس کے مُنہ سے کراہیں نکلنے لگیں۔ ساتھ ہی بے ربط جملے بھی ادا کر رہا تھا "ارے، بالکل مر جاؤں گا۔ ۔ ۔ سبز دوپٹے والی ۔ ۔ ۔ ہائے اُبٹن ۔ ۔ ۔ اُبٹن ۔ ۔ ۔ ہائے ہائے ۔ ۔ ۔"

میرے لئے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہوگیا۔ لہٰذا میں نے اُٹھ کر باہر کی راہ لی اور دروازے کے قریب ہی پیٹ پکڑ کر بیٹھ گیا۔

دفعتاً اندر سے آواز آئی۔ "ارے بی بی صاحب ۔ ۔ ۔ مم میں کیسے اُترا؟"

"خاموش رہو۔" نسترن بانو کی قہرناک آواز آئی۔ "بہروپئے، فریبی ہماری پول کھولنے آئے تھے۔"

"جج ۔ ۔ ۔ جی ۔ ۔ ۔ گگ ۔ ۔ ۔ کیا ۔ ۔ ۔ نخ ۔ ۔ ۔!" فیض الحسن کی ہکلاہٹ سنائی دی اور میں اٹھ کر اندر آیا۔ وہ فرش پر دوزانو بیٹھا چُندھیاتی ہوئی آنکھوں سے نسترن بانو کو دیکھے جا رہا تھا۔

"ہم کو دھوکا دینے کی کوشش کی تھی۔ ہم جو سارے احوال سے برحمتِ پروردگار آگاہ ہو جاتے ہیں۔"

"جج ۔ ۔ ۔ جی۔ میں نہیں سمجھا؟"

"کیا تم مسجد کے امام نقیرالدین کے بھانجے نہیں ہو؟"

اُس کا مُنہ حیرت سے کھلا اور کھلا ہی رہ گیا۔

" فقیرالدین ہمیں بہروپیا سمجھتا ہے۔ گاؤں والوں کو ہمارے خلاف ورغلانے کی کوشش کرتا ہے "

" مم . . . میں بےقصور ہوں، بی بی صاحب " وہ ہاتھ جوڑ کر گھگھیایا۔

" میں یہ جانتی تھی۔ اسی لئے تم کو اس پر آمادہ کیا تھا کیونکہ تم گاؤں والوں کے لئے اجنبی تھے "

" یہی بات ہے۔ یہی بات ہے " وہ جلدی سے سر ہلا کر بولا۔

" اٹھو۔ ہاتھ منہ دھوؤ . . . . اور وہ اُدھر کھانا رکھا ہوا ہے "

" مم . . . میرا دل تو چاہ رہا ہے کہ خودکشی کر لوں " وہ روہانسا ہو کر بولا۔

" اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے لئے حکم ہے کہ ہم اپنے دشمنوں کو معاف کر دیں "

وہ نسترن بانو کے آگے سجدے میں گر گیا اور چیخ چیخ کر رونے لگا اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ نسترن بانو کی چُٹیا پکڑ لوں اور گھسیٹ گھسیٹ کر مارتا پھروں۔ دفعتاً میں نے کہا " یہ کیا کر رہا ہے؟ سیدھا بیٹھ "

وہ بوکھلا کر اُٹھ بیٹھا اور نسترن بانو بڑی ڈھٹائی سے بولی۔ اللہ کے علاوہ اور کسی کے آگے سجدہ ریز نہیں ہوتے "

وہ دو زانو بیٹھا دھاڑیں مار مار کر روتا رہا۔ بڑی دشواریوں سے خاموش ہوا تھا لیکن کھانا کھانے پر تیار نہیں تھا۔ ڈانٹ ڈپٹ کر اُسے اِس پر آمادہ کیا۔

کھا چکا تو بولا " مجھے ماموں جان سے نفرت ہو گئی ہے۔ خاص طور سے مجھے اس کے لئے بُلوایا تھا "

" جلد ہی وہ بھی راہِ راست پر آ جائے گا " نسترن بانو بولی۔

" میرا دل چاہتا ہے کہ اب خلوصِ دل سے ساری زندگی آپ کی خدمت میں گزار دوں "

" اس کی ضرورت نہیں ہے " نسترن نے کہا۔ " جہاں سے آئے ہو وہیں واپس جاؤ۔ تم ہمارے کام کے نہیں ہو "

" یہ سُن کر مایوسی ہوئی، بی بی صاحب "

" تم دو چار دن ہمارے ساتھ رہو گے اور اکبر آباد چلے جاؤ گے۔ ہم کسی کی بےعزتی کے خواہاں نہیں ہیں ورنہ گاؤں والے تو اس حرکت پر تم دونوں ماموں، بھانجے کی تکا بوٹی کر کے رکھ دیں گے "

" بجا فرمایا اور واقعی ہم اسی قابل ہیں "

" لیکن ہمارے لئے حکم ہے کہ ہم معاف کر دیں "

●●

تین چار دن بعد ہم نے فیض الحسن عرف مٹھو میاں کو رخصت کر دیا۔ جاتے وقت بُری طرح رو رہا تھا۔ کسی طرح جانے پر رضامند ہی نہیں تھا۔ میں نے دل میں کہا او، احمق یہ جشنِ اُبٹن سال بھر برپا نہیں رہے گا۔

وہ چلا گیا اور اس کے بعد ہی سے مسجد کے امام نے گاؤں والوں سے کہنا شروع کر دیا کہ اسے خواب میں بشارت ہوتی ہے کہ دونوں میاں بیوی ولی اللہ ہیں اور پھر خود بھی حاضری دینے لگا تھا۔

جشنِ اُبٹن کے اختتام پر پھر وہی سناٹا تھا اور ہم تھے۔ نسترن ناشتا کر کے بستی میں چلی جاتی اور دوپہر کے کھانے کے ساتھ واپس آتی۔ عصر اور مغرب کے

درمیان کچھ گاؤں والے آجاتے اور عشاء سے قبل چلے جاتے۔

پھر پہاڑ سی رات ہوتی اور نسترن بانو کا جان جلانے والا وجود۔ ایک رات ہنس کر بولی "سُنا تم نے۔ تمہاری شہرت اُبٹن شاہ کے نام سے ہو رہی ہے" میں کچھ نہ بولا۔ اس نے ہنس کر کہا "تمہارے حُسن کے بھی شہرے ہیں"

"مجھ سے کیا سُننا چاہتی ہے؟" میں طیش میں آکر بولا۔

"تمہاری حیثیت ہی کیا ہے، میری نظروں میں کہ تم سے کچھ سُنوں گی"

"بس تو پھر مجھ سے مخاطب ہونے کی ضرورت نہیں ہے"

"تو پھر کیا دیوار سے باتیں کروں۔ تمہارے علاوہ اور کون ہے یہاں"

میں نے بیزاری سے منہ پھیر لیا وہ تھوڑی دیر بعد بولی "چہرے پر کھونٹیاں تو نکلنے لگی ہیں۔ دیکھنا کیسی چھٹے وار داڑھی اُگتی ہے"

"خاموش رہ، مجھے نیند آرہی ہے"

"مجھے تو نہیں آرہی اس لئے تمہیں بھی نہیں آسکتی۔ . . . ہاں اور کچھ سُنا مسجد کا امام تو اب آئے دن لوگوں کو تمہارے بارے میں نئے خواب سناتا رہتا ہے"

نسترن بانو کبھی تو مجھے بھول جانے دیا کر کہ تُو نے مجھے شیطان الرجیم بنا کر رکھ دیا ہے"

سنتنا کر اُٹھ بیٹھی اور پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولی "اور مجھ سے پہلے تم کیا تھے؟"

مجھے یاد آگیا کہ میں "مُرشد" ہی بن کر تو اُس کا جن اتارنے گیا تھا لیکن وہ مجبوری تھی۔ سوچا تھا کچھ دنوں کے بعد اکبر آباد ہی سے بھاگ نکلوں گا اور پھر مجھے ریاکاری کی اُس زندگی سے نجات مل جائے گی۔ . . . لیکن یہ مردود عورت کسی جن ہی کی طرح مجھ پر مُسلط ہو گئی۔ پھر تو اس دلدل میں پھنسا ہی چلی

گئی تھی۔

"بولو۔ خاموش کیوں ہو گئے۔ جواب دو۔ مجھ سے پہلے تُم کیا تھے"

"کہہ دیا نا کہ مجھے نیند آرہی ہے" میں نے بے بسی سے کہا۔

"جیسی بھی تھی بُری بھلی زندگی گزار رہی تھی۔ تم آتے اور تم نے میری آسیب زدگی کی پول کھولنے کی کوشش کی اور بات اس حد تک بڑھی کہ خود تم ہی نے مجھے طلاق دلوانے کی سعی کر ڈالی۔ اس کے بعد میں کہاں جاتی۔ . . کیا کرتی۔ دُنیا میں میرا کون تھا"

"قطب تُلی تجھ سے نکاح کرنا چاہتا تھا"

"مجھے اِس بندھن سے نفرت ہو گئی ہے"

"لیکن اس کا ڈھونگ رچائے بغیر کام نہیں چلا" میں بھی طیش میں آکر اُٹھ بیٹھا۔

اگر رجب خان والا حادثہ پیش نہ آیا ہوتا تو اس کی ضرورت ہی نہیں تھی" اُس نے کہا اور سنبھل کر بولی "آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو"

"کیا یہ ڈھونگ کسی طرح بھی دُرست ہے؟"

"کسی ولی اللہ کو ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں جیسی تم کر رہے ہو"

"خُدا کے لئے تنہائی میں تو ایسی باتیں نہ کیا کر"

"میں کیا کروں، خلقِ خُدا یہی کہتی ہے۔ میں نے تو بات صرف مُرشد ہی تک رکھی تھی۔ مسجد کے امام نے تمہیں ولی اللہ بنا دیا۔ میرا اس میں کیا قصور ہے"

"پوری بستی میں صرف وہی ایک حق پرست تھا۔ تیری چالاکیوں نے اُسے بھی خراب و خوار کیا"

"اچھا تو کیا پھر ہم خراب و خوار ہوتے۔ اُس کی مکاری اس کے منہ پر

ماردی۔ بھانجے کو کھوجی بناکر بھیجا تھا مردود... نے۔"

میں بُرا سا مُنہ بناکر رہ گیا۔ اس پر وہ ہنس کر بولی "بالکل اُبٹن شاہ لگتے ہو۔"

میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ ہم بُری طرح چونکے۔ خلافِ معمول اتنی رات گئے کون ہوسکتا ہے۔ دستک پھر ہوئی اور میں نے جی کڑا کر کے اُونچی آواز میں پوچھا "کون ہے؟"

"فیض الحسن . . . ." مری مری سی آواز آئی اور نسترن بانو کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ پھر اُس نے مجھے دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا۔ فیض الحسن باحالِ پریشان سامنے کھڑا تھا، مجھے دیکھتے ہی قدموں پر گر پڑا۔

"اُٹھو!" عقب سے نسترن بانو کی آواز آئی "تم پھر کیوں آگئے؟"

"دُنیا سے دل اُچاٹ ہوگیا ہے، بی بی صاحب۔ اب تو بس اپنی ہی خدمت میں حاضر رہنے کی اجازت دیجیے۔"

میں نے اُسے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کے بال اُلجھے ہوئے اور گرد آلود تھے۔ چہرے سے بے انداز تھکن ظاہر ہو رہی تھی۔ نسترن بانو ایک طرف ہٹ گئی اور وہ حجرے میں داخل ہوا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

ایک طرف بیٹھ گیا اور باقاعدہ آواز سے رونا شروع کر دیا۔ اتنا رویا کہ ہچکی لگ گئی۔ ہم دونوں حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھے جا رہے تھے آخر کار نسترن بانو بولی "تجھے سمجھا دیا گیا تھا کہ یہاں رہنے میں تیری خرابی ہوگی۔ تیرا ماموں بستی میں موجود ہے وہ آخر کب تک تجھے اجنبیوں کی طرح دیکھتا رہے گا۔ اگر یہ بات ظاہر ہوگئی کہ تو اس کا بھانجا ہے تو ہم بھی

جھوٹے بنیں گے۔"

"میں سب سمجھتا ہوں بی بی صاحب، لیکن دل نہیں مانتا۔"

"میں یہ بھی اچھی طرح جانتی ہوں کہ دل کیوں نہیں مانتا، لیکن یہ فقیروں کی خانقاہ ہے۔ یہاں تجھ جیسے دُنیا کے کُتّے نہیں رہ سکتے۔"

"میں مجاہدہ کروں گا اور اپنے وجود سے وہ شے نکال پھینکوں گا جس کی وجہ سے آپ مجھے سگِ دُنیا کہہ رہی ہیں۔"

"حالانکہ وہی کُتّا پن تجھے دوبارہ یہاں لایا ہے۔"

"میں نہیں سمجھا، مائی صاحب؟"

"گھڑوں پانی پڑ جاتے گا تجھ پر اگر میں نے وہ بات کہہ دی۔"

"یہ بھی کر کے دیکھ لو۔" میں نے برافروختگی ظاہر کرتے ہوئے کہا "یہ کم بخت تو چکنا گھڑا ہے۔"

"حضور مجھ پر کرم فرمائیے۔" وہ ہاتھ جوڑ کر گڑگڑایا۔

"مکاری کی باتیں ختم کر۔" نسترن بانو بولی "سبز دوپٹے والی کا حصول تیرے لیے ناممکن ہوگا۔"

وہ حیرت سے مُنہ کھول کر رہ گیا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پیٹنے لگا۔

میں سوچ رہا تھا کہ سبز دوپٹے والی کی بات کہاں سے نکل آئی اور پھر اُس کا رویہ ظاہر کر رہا تھا جیسے نسترن بانو نے سچ مچ چور پکڑ لیا ہو۔ اچانک مجھے یاد آگیا کہ بحالتِ بے ہوشی اُس نے کسی سبز دوپٹے والی کا حوالہ دیا تھا اور ہائے ہائے کرتا رہا تھا۔ بس، نسترن بانو کو اپنی غیب دانی کا سکہ جمانے کا ایک اور موقع ہاتھ آگیا۔

"ساکت ہو جا یہ کیا بے ہودگی!" دفعتاً وہ ڈپٹ کر بولی اور فیض الحسن کے ہاتھ رُک گئے، لیکن اب اُس نے چُپ سادھ لی تھی اور بہ حسرت و یاس نسترن بانو کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

"وہ بستی کے مالدار بقّال کی بیٹی ہے اور تو خیرات کے ٹکڑوں پہ پلنے والے ایک ماموں کا بھانجا ہے۔" نسترن بانو نے سرد لہجے میں کہا "اگر تیری نیّت کا علم اُس کے باپ کو ہو گیا تو تیری زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔"

"لیکن بی بی صاحب، میں تو خیرات کے ٹکڑے پر نہیں پلا۔ میرا باپ عدالت میں عرائض نویس ہے۔"

"بکواس بند کر اور واپس جا۔"

"میں مر جاؤں گا، بی بی صاحب۔"

"کم بخت کیا اس خانقاہ کو لیلیٰ مجنوں کا اکھاڑہ بنائے گا۔"

"عشقِ حقیقی ہے، بی بی صاحب!" وہ ڈھٹائی سے بولا "بس جمعرات کے جمعرات دیدار کر لیا کروں گا۔"

"یہ ناممکن ہے۔" وہ پیر پٹخ کر بولی۔

"بس تو پھر اب یہاں سے میری لاش ہی جائے گی۔"

"میں یہیں تجھے مار ڈالوں گی۔"

"احسان ہو گا مجھ پر۔ اس عذاب سے نجات ملے گی۔"

نسترن بانو نے بے بسی سے میری طرف دیکھا اور میں اپنی بے ساختہ تبسم کی مسکراہٹ کو کسی طرح نہ روک سکا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کے آثار نظر آئے اور پھر غائب ہو گئے۔

میں نے کہا "فکر نہ کرو، میں اس کے عشق کو عشقِ الٰہی کی طرف موڑ دوں گا۔

لیکن میں نے اس کی آنکھوں میں صاف پڑھا جیسے کہہ رہی ہو "جھک مارو گے۔" فیض الحسن نے میری زبان سے یہ سُنا تو دھڑام سے میرے قدموں پہ آ گرا۔

"تم اس کی حوصلہ افزائی کر رہے ہو، میاں صاحب۔" نسترن بانو غرائی۔

"تم نہیں سمجھتیں۔ یہ بھی برگزیدہ ہونے والا ہے۔"

"فضول بات ہے۔"

"منزلیں ہیں سلوک کی۔" میں نے مسکرا کر کہا "مجھے شادی کے بعد عرفان ہوا تھا۔ اسے صرف عرفان ہو گا۔ شادی نہیں ہو سکے گی۔"

نسترن بانو نے دانت پیس کر مجھے گھونسہ دکھایا کہ وہ تو اندھا پڑا ہوا تھا۔ میرے قدموں پہ، ہماری حرکتیں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"اُٹھ...!" میں نے ڈپٹ کر کہا "اور مزار شریف کے اسی گوشے میں جا کر پڑ رہ، جہاں پہلے بھی سویا تھا۔"

وہ دوزانو بیٹھتا ہوا بولا "بھوکا بھی ہوں یا حضرت صبح سے کچھ نہیں کھایا۔"

"اسی وقت سے مجاہدہ شروع کر دے کہ کھانے کو کچھ بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

وہ اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا حجرے سے نکل گیا۔

نسترن بانو بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بے بسی کی حد نہ رہی ہو۔ آخرکار ٹھنڈی سانس لے کر دروازے کی طرف مڑی اور کُنڈی لگا کر بستر پہ آ بیٹھی اور مجھے اس طرح دیکھنے لگی جیسے پہلی بار دیکھا ہو۔

"آخر تمہیں یہ کیا سوجھی تھی۔" اس نے کہا۔ غیر متوقع طور پر اُس کا لہجہ

بے حد نرم تھا۔ میں تو سمجھا تھا کہ پھٹ پڑے گی۔

"پھر اور کیا کرتا۔ وہ ٹلنے والا نہیں تھا۔"

"لیکن اب ہوگا کیا؟"

"مفت میں ایک خادم ہاتھ آیا ہے۔"

"تم سمجھتے کیوں نہیں۔ وہ ایک لڑکی کے چکر میں ہے اور ہمیں قطعی طور پر بہروپیا سمجھتا ہے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"بہروپیا نہ سمجھتا ہوتا تو اتنی ڈھٹائی سے اعتراف نہ کر لیتا۔"

یہ بات بھی سمجھ میں آنے والی تھی۔ ہر چند کہ نسترن بانو نے اس کے دل کی بات کہہ دی تھی۔ اُس کا رویہ انکار پر مبنی ہونا چاہیے تھا، اگر ہمیں برگزیدہ سمجھتا تھا۔

میں نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ "تم فکر نہ کرو۔ میں اُسے بھاگنے پر مجبور کر دوں گا۔"

"اُس میں وقت لگے گا" نسترن بانو پُرتشویش لہجے میں بولی۔

"تو اس سے کیا فرق پڑے گا۔"

"بہت فرق پڑے گا۔ اس دوران میں کسی طرح اگر یہ بات کھُل گئی کہ وہ مسجد کے امام کا بھانجا ہے اور اکبر آباد کا باشندہ ہے تو لوگ ہمارے بارے میں کیا سوچیں گے۔"

یہ بات بھی قاعدے کی تھی۔ مجھے اس پر غور کرنا پڑا۔ "تم فکر نہ کرو۔ اب چین سے سو جاؤ۔ صبح بستی میں پہنچتے ہی پیش امام کو میرے پاس نہ بھیج دینا۔" میں نے بالآخر کہا۔

"تُم نہ جانے کون سی بے وقوفی کر بیٹھو؟" نسترن بولی اور مجھے غصہ آ گیا۔ خود کو پتہ نہیں کیا سمجھنے لگی ہے۔

"اچھی بات ہے، جو دل چاہے کرو مجھے کوئی سروکار نہیں اِن معاملات سے۔ نہ تم جشن اُبٹن برپا کرتیں اور نہ یہ سب کچھ ہوتا۔ خود بھگتو، مجھے نیند آ رہی ہے۔"

میں نے بستر پر لیٹ کر اُس کی طرف سے کروٹ لے لی۔

دوسری صبح اُس کا مُنہ پھُولا ہوا تھا، جیسے ہی فیض الحسن نے آ کر سلام کیا۔ اُس پر برس پڑی۔

"تمہیں شرم نہیں آتی کہ اِس خانقاہ میں ایسی بے ہودہ خواہش لے کر آئے ہو۔ تمہیں اس کی جرأت کیسے ہوئی۔"

وہ سر جھکائے کھڑا رہا اور وہ گرجتی برستی رہی۔ عجیب ہی ڈھیٹ آدمی تھا۔ کبھی کبھی حسرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ لیتا تھا۔ سمجھتا تھا شاید میں اُس کی طرف داری کروں گا، لیکن میں خاموش ہی رہا۔

ناشتے میں ہمارا شریک ہوا تھا۔ نسترن بانو حسبِ معمول گاؤں چلی گئی، وہ میرے قریب بیٹھ کر میرے پاؤں دبانے کی کوشش کرنے لگا۔

"یہ کیا کر رہا ہے؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"پھر کیا کروں۔ اِن قدموں کے علاوہ مجھے آپ اور کچھ نہیں دکھائی دیتا۔۔"

"اسی سبز دوپٹے والی کے لئے۔"

"رات آپ نے بڑی حوصلہ افزائی کی تھی" وہ مُردہ سی آواز میں بولا۔

"تو بہت تھکا ہوا تھا اور ہمیں بھی نیند آ رہی تھی، لہٰذا وقتی طور پر بات ختم کرنے کے لئے میں نے تیری طرفداری کر دی تھی۔"

"بس تو پھر میں یہیں آپ کے قدموں میں جان دے دوں گا۔"

"لیکن اُس بسنر دوپٹے والی کے عشق سے باز نہیں آتے گا۔"

"میں کیسے باز آؤں" وہ حیرت سے بولا "عشق کیا نہیں جاتا، ہو جاتا ہے۔ قیس کو پاگل کتے نے نہیں کاٹا تھا کہ عشقِ لیلیٰ میں مر گیا۔ فرہاد باؤلا نہیں تھا کہ تیشے سے سر ٹکرا کر فنا ہو گیا۔"

"وہ دولت مند باپ کی بیٹی ہے۔ تیرے پلّے کیا ہے؟"

"نقدِ جان۔ یہی قربان کر دوں۔"

"تو جا۔ اُسی کے در پر ڈیرہ ڈال دے۔ یہاں تیرا کیا کام۔"

"آپ نے تو رات فرمایا تھا کہ عشقِ مجازی کو عشقِ حقیقی کی طرف موڑ دیں گے۔"

میں نے سوچا کہ پیچھا نہیں چھوڑے گا۔ اُدھر نسترن بانو کا خیال آیا کہ اب کے کہیں واقعی کوئی حماقت نہ کر بیٹھے اور ہم ہی مارے جائیں گے۔ غصّہ عقل کو خبط کر دیتا ہے۔ پہلے جو کچھ ہوا اُس کی بات اور تھی۔ اُسے سرکاری کھوجی سمجھ کر مار ڈالنا چاہتی تھی، لیکن حقیقت کچھ اور تھی۔ کسی نہ کسی طرح بات بن گئی، لیکن اب دوسرا معاملہ تھا۔ کہیں فیض الحسن ہی اضطراب میں کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھے کہ ہم کسی کو مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہ جائیں۔ آخر گاؤں والے اُسے کسی مُرشد کا فرستادہ سمجھتے تھے اور اس کی تصدیق بھی ہمارے ہی توسط سے ہوئی تھی۔

"اچھا" میں نے آہستہ سے کہا "تو بھی کیا یاد کرے گا۔"

"جی، کیا فرمایا" وہ چونک کر بولا۔

"کچھ نہیں۔ میں کہہ رہا تھا کہ عشقِ مجازی کو عشقِ حقیقی میں تبدیل کرنا ہی پڑے گا۔"

"کچھ بھی کیجئے۔ مجھے اپنے قدموں سے جُدا نہ کیجئے۔"

"ایسا ہی ہوگا" میں نے کہا۔

"لیکن بی بی صاحب۔ مجھے اُن سے بہت ڈر لگتا ہے۔"

"ہمیں بھی لگتا ہے کیوں کہ وہ راہِ سلوک میں ہم سے بہت آگے ہے جو کہہ دیتی ہے، وہی ہوتا ہے۔"

"وہ مجھ سے برگشتہ ہیں، حالانکہ میں خلوصِ دل سے اپنے کئے کی معافی مانگ چکا ہوں۔"

"وہ معاف کر چکی تھی، لیکن تُو پھر آ ٹپکا۔"

"میں کیا کروں، میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اُس کی صورت میرے دل پر نقش ہو چکی ہے۔ مٹانا چاہوں بھی تو نہیں مٹا سکتا۔"

دفعتاً باہر سے آواز آئی "میں حاضر ہو سکتا ہوں یا حضرت" اور میں نے آواز پہچان لی۔ فیض الحسن کا ماموں، پیش امام فقیر الدین تھا۔ میں نے اسے باریابی کی اجازت دی۔ لیکن وہ دروازے میں قدم رکھتے ہی ٹھٹک گیا۔ نامعقول بھانجے پر نظر پڑی تھی۔ اِدھر فیض الحسن بھی اسے دیکھ کر بدحواس ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دونوں کی زبانیں گنگ ہو کر رہ گئی ہوں۔

دونوں ماموں بھانجے سحر زدگی کے سے عالم میں پلکیں جھپکائے بغیر ایک دوسرے کو دیکھے جا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انہیں اپنی بصارت پر یقین ہی نہ آ رہا ہو۔

"بیٹھ جاؤ" میں نے اونچی آواز میں کہا۔ اور وہ بوکھلا کر دوزانو بیٹھ گئے۔ بالکل ایسے لگ رہا تھا جیسے دو مینڈک ایک دوسرے کے مقابل بیٹھے گہری گہری سانسیں لے رہے ہوں۔

"فقیر الدین" میں نے پیش امام کو مخاطب کیا۔

"ارشاد، پیر و مرشد" وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"فیض الحسن اب تیرے کام کا نہیں رہا۔ الٹا لٹکنے کے بعد اس کی دُنیا ہی بدل گئی ہے۔"

"دراصل۔۔۔ لیکن۔۔۔ پیرومرشد۔"

"ہم سمجھتے ہیں تو کیا کہنا چاہتا ہے۔ ٹھیک ہے کہ ہم نے اسے واپس بھجوا دیا تھا لیکن تو اسے کیا کرے گا کہ سارے تار اوپر ہی سے ملتے ہیں۔"

"میں نہیں سمجھا، پیرومرشد۔"

"بس اتنا ہی سمجھ لے کہ تیرا بھانجہ اب دُنیا کے کام کا نہیں رہا۔ حکم ہوا ہے کہ ہم اسے تعلیم کریں۔"

"زہے نصیب یا حضرت! میرے لئے تو باعث مسرت ہے یہ بات۔"

"لیکن تو اپنی زبان بند رکھے گا۔ ایسا بن جائے گا، جیسے یہ تیرے لئے بالکل اجنبی ہو۔ قصبے والوں کو تیرے اور اس کے رشتے کا علم ہرگز نہ ہونے پائے۔"

"آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی۔"

"اور تجھے بھی اس کا خیال رکھنا پڑے گا۔" میں نے فیض الحسن کی طرف دیکھ کر کہا۔

"میں تو حکم کا بندہ ہوں یا حضرت۔" وہ گھگیا کر بولا۔

میں نے پھر پیش امام سے کہا۔ "فیض الحسن تجھے خواہ کسی حال میں نظر آئے، تیرا فرض ہوگا اپنی زبان بند رکھے۔"

"جو حکم۔۔۔"

"بس یہی کہنے کے لئے ہم نے تجھے طلب کیا تھا۔"

اس کا مطلب یہ تھا کہ اب اس کی موجودگی ضروری نہیں ہے۔ وہ اُٹھ کر

آداب بجا لایا اور چلا گیا۔

فیض الحسن عرف مٹھو میاں چونچ اٹھائے میری شکل تکے جا رہا تھا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "اب تو سن۔!"

"گوش بر آواز ہوں پیرومرشد۔" بڑی سعادت مندی سے بولا۔

"لیکن نہیں۔" میں نے کہا۔ "ابھی تو ہم سے کچھ نہیں سنے گا۔ ابھی تو ہم تجھ سے سنیں گے۔"

"میں کیا عرض کروں یا حضرت!"

"اپنے سارے کوائف سے ہمیں آگاہ کر۔"

"مجھ جیسے آدمی کے کیا کوائف ہوں گے۔ شہزادہ تو ہوں نہیں۔ ماں بچپن میں مر گئی تھی۔ باپ نے دوسری شادی کی۔ طبعاً سخت گیر ہے۔ سوتیلی ماں کم از کم سوتیلی اولاد کے لئے تو سخت گیر ہوتی ہے۔ سو میرے نصیب میں والدین کی سخت گیری کے علاوہ کبھی اور کچھ نہیں رہا۔"

"کوائف سے میری مراد یہ تھی کہ اس مضغۂ گوشت کو کہ دل کہلاتا ہے۔ اور کس کس کے قدموں پہ ڈال چکا ہے۔"

"یہ تو یاد نہیں۔" بڑی معصومیت سے بولا۔

میں اسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ کتنی ڈھٹائی سے اپنے دل پھینک ہونے کا اعلان کر رہا تھا۔

"تیرے اس جواب کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ جہاں تو نے اچھی شکل دیکھی اور ڈھیر ہو گیا۔" میں نے غضبناک ہو جانے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"قہر درویش بر جانِ درویش۔"

"کیا کہنا چاہتا ہے؟" میں اور زور سے بگڑا۔ شبہ ہوا تھا جیسے مجھ پر طنز کر رہا ہو۔
"میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ غریب آدمی محبت کے معاملے میں بھی چور ہوتا
ہے۔ جس سے محبت کرتا ہے اسے پتہ نہیں چلنے دیتا کہ محبت کر رہا ہے۔"
"میں سمجھ گیا۔ تیرا مشغلہ یہی ہے۔"
اس نے کچھ کہنے کے بجائے سر جھکا لیا۔ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔
"غریب آدمی کی محبت کا اظہار ہو جاتے تو وہ بُری طرح مار کھاتا ہے لیکن اگر کوئی
سوداگر بچہ محبت کر بیٹھے تو بڑی بڑی مثنویاں لکھ دی جاتی ہیں جنہیں ایک زمانہ
سنتا ہے اور اپنے ہی سر دھنتا ہے۔"
فیض الحسن کی محبت اسی کا سر دُھنوا کر رکھ دیتی ہے۔ ۔ ۔" اور پھر یا حضرت،
یہ حقیر پُر تقصیر تو حسن از کا شیدا ہے۔ حُسنِ صورت میں بھی حُسنِ ازل کی جھلک نظر آتی اسی
کے پیچھے ہو لیا۔"
"سبحان اللہ۔ کیا جواز لایا ہے اپنی اس بدبختی کا۔" میں نے دانت پیس
کر کہا۔
"مقدر کے ہاتھوں میں کھلونا ہوں یا حضرت۔"
"میری زوجہ کے سامنے ایسی باتیں ہرگز نہ کیجیو ورنہ جوتیاں لگاتے
گی۔"
"حالِ دل ہر ایک سے نہیں کہا جاتا یا حضرت۔ آپ اہل دل نظر آتے،
سو گوش گزار کر دی اپنی بپتا۔"
"ہماری زوجہ کو عشق عاشقی سے سخت نفرت ہے۔"
"اسی لئے ان سے میری روح فنا ہوتی ہے۔ آپ ہی جیسے ولی اللہ کا کام
ہے ان کے ساتھ خوش رہنا۔ اسے بھی آپ کی کرامت ہی سمجھتا ہوں۔"

مردود چوٹ کر گیا تھا۔ خاموشی سے سہنی پڑی۔
اور پھر اچانک وہ بلائے بے درماں نازل ہو گئی۔ یعنی نسترن بانو خلافِ
معمول ہی تھا۔ فیض الحسن کو میرے قریب ہی بیٹھے دیکھ کر تیوریاں چڑھائیں
اور بولی "تو یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے۔ جا مزار شریف کو غسل دے ڈال۔"
وہ بوکھلا کر اٹھا اور باہر نکل گیا۔ میں مجسّم سوال بنا نسترن کی طرف دیکھے جا رہا
تھا۔ وہ میرے قریب آکر آہستہ سے بولی" رسول بخش بقال کی بہو پر شیخ سدو آ
گیا ہے۔"
"تو پھر میں کیا کروں؟"
"جس طرح میرا جن اُتارا تھا۔ اسی طرح اس کا شیخ سدو بھی اُتارو، میرے
قابو میں تو نہیں آرہی ہے۔ پہلے کبھی شیخ سدو نہیں اُتارا، جن بھتوں کے اتارے
ہیں۔ شیخ سدو سے میری جان پہچان نہیں ہے۔"
فضول باتیں مت کرو۔ یہ آزمائش کا وقت ہے۔"
"اگر سچ مچ شیخ سدو ہوا تو کہیں تمھیں ہی میرے اوپر سے نہ اتار دے۔"
"ارے ڈھونگ ہے۔"
"ڈھونگ کی کوئی خاص وجہ؟"
"ساس بہو میں بنتی نہیں ہے۔ وہ اپنے میاں یعنی بقال کے بیٹے کو
اپنے ماں باپ کے گھر رکھنا چاہتی ہے۔"
"بڑا بدبخت ہے کہ جورو کا کہنا نہیں مانتا۔"
"پالکی آ رہی ہوگی۔ تم گاؤں چلنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔"
"یہ نہیں ہو سکتا۔ پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ میں اپنی جگہ سے ہرگز نہیں
ہلوں گا اور پھر ایک بقال کی بہو کے لئے۔ اسے یہیں لے آؤ۔"

"اسے یہاں لانا ممکن نہیں۔ آپے سے باہر ہو رہی ہے، جو کپڑے پہنائے جائیں، چیر پھاڑ کر پھینک دیتی ہے۔"

"ارے... تب تو مجھے چلنا ہی چاہئیے۔ پاگلوں کی طرح کھجاتی بھی ہے کیا۔؟"

"ہاں... ہاں..." وہ حیرت سے بولی۔ "تم کیا جانو؟"

"میں کیا نہیں جانتا..." میں نے اکڑ کر کہا۔ "تو آخر مجھے کیا سمجھتی ہے۔ بس تقدیری امور ہیں کہ تیرے پنجے میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ اوپر والے کی مصلحتیں۔ جب چاہوں تجھے جلا کر خاک کر دوں۔"

"بس میاں صاحب، جامے میں رہو۔" وہ تیوری چڑھا کر بولی۔ "دیکھوں گی کہ اس کا سشیخ سدو کس طرح آتارتے ہو۔ میرے جن سے تو شکست کھا گئے تھے۔ ارے ہاں، وہ پیش امام آیا تھا؟"

"آیا تھا اور چلا بھی گیا۔"

"اس سے کیا باتیں ہوئیں؟"

"باتیں کیا ہوتیں۔ بس اسے سمجھا دیا ہے کہ فیض الحسن کے لئے بالکل اجنبی بنا رہے۔"

"تو کیا فیض الحسن اب ہمارے سروں پر سوار ہی رہے گا؟"

"ابھی تو یہی صورت ہے۔ اس کے بارے میں جو کچھ بھی اعلان کرنا ہوگا، جمعرات کی مجلس میں کروں گا۔"

"اعلان کرو گے کس بات کا؟"

"یہی کہ فیض الحسن پورے قصبے کی جھاڑ دیا کرے گا۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" اس نے مضحکہ اڑانے کے سے انداز میں پوچھا۔

"تو کیا جانے ان اسرار و رموز کو۔ پہلے اس کی انا تو ٹھکانے لگاؤں گا اور پھر تعلیم کروں گا۔"

"تم تعلیم کرو گے۔ شکل دیکھو اپنی۔"

"اپنی حد سے آگے نہ بڑھو۔ ورنہ میں اس کا سشیخ سدو اتارنے سے انکار کر دوں گا۔"

"خواہ مخواہ بات نہ بڑھاؤ۔" وہ آنکھیں نکال کر رہ گئی۔

میں قصبے کی طرف جانے کی تیاری کرنے لگا۔ عرصے سے اس جگہ سے ہلا بھی نہیں تھا۔ خوشی ہوئی تھی، اس متوقع تبدیلی سے... اور پھر فیض الحسن کا معاملہ بھی تھا۔ میں نے اس سبز دوپٹے والی کی طرف توجہ ہی نہیں دی تھی، جس پر وہ لٹو ہو رہا تھا۔ بہر حال، وہ تھی، اس رسول بخش بقال کی بیٹی۔ جس کی بہو پر شیخ سدو آ جانے کی اطلاع ملی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کس مرض میں مبتلا ہے۔ اس کا احوال سن کر میں نے اسی لئے سوال کیا تھا کہ دیوانوں کی طرح جسم تو نہیں کھجاتی؟ جواب اثبات میں ملنے پر مرض کا اندازہ ہو گیا تھا اور ساتھ ہی اس کا علاج بھی یاد آ گیا تھا، چونکہ بچپن سے نوجوانی تک مختلف قسم کے پیشوں سے منسلک رہ چکا تھا۔ اس لئے بہتیرے معاملات میں اچھے عمر دار لوگوں سے بھی زیادہ تجربہ کار تھا۔ ایک حکیم صاحب کے عطار خانے میں بھی کام کر چکا تھا اور ان کے طریقے علاج پر بھی بنظر غائر توجہ دی تھی۔ وہ سارے امراض کا علاج جڑی بوٹیوں سے کیا کرتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ بقال کی بہو نے مچھلی کے ساتھ مسور کی دال بھی کھائی ہو گی۔ اسی لئے کھجلی کے اس دورے سے دوچار ہوئی ہے۔

میں نے نسترن بانو سے پوچھا۔ "کیا پہلے بھی کبھی اس پر شیخ سدو آیا تھا؟"

”نہیں۔ پہلی بار آیا ہے۔ پچھلی رات سر میں چنبیلی کا تیل ڈال کر چاندنی میں چھت پر چڑھی تھی۔“

”اور کھایا کیا تھا پچھلی رات کو؟“

”تم تو بڑے پہنچے ہوئے ہو۔ از رُوئے کشف بتاؤ کہ اس نے پچھلی رات کو کیا کھایا ہو گا۔“ جلے کٹے لہجے میں بولی۔

”بتا دوں۔ ۔ ۔ ؟“ میں نے پُرجوش لہجے میں پوچھا۔

”چلو رہنے دو۔ ۔ ۔“ وہ بُرا سا منہ بنا کر بولی۔

”اچھی بات ہے۔ وہیں چل کر بتاؤں گا۔“

تھوڑی دیر بعد میرے لئے پالکی آگئی تھی اور نسترن بانو کی ڈولی تو پہلے ہی سے موجود تھی۔ رسول بخش بقال خود آیا تھا، پالکی کے ساتھ، میں نے اُسے حجرے میں طلب کر کے مریضہ کا حال پوچھا۔ اس نے بھی چنبیلی کے تیل اور چاندنی رات کا قصہ شروع کر دیا۔

”پچھلی رات اس نے کیا کھایا تھا؟“ میں نے سوال کیا۔

”مچھلی کھائی تھی شاید۔ ۔ ۔ حضور۔“

”اور مسور کی دال بھی۔“

”جی حضور۔ ۔ ۔ ۔ وہ تو روزانہ پکتی ہے۔“

”گویا مچھلی اور مسور کی دال ساتھ کھائی تھیں۔“

”جی حضور۔ ۔ ۔“

”پہلے بھی کبھی ایسا دورہ پڑا تھا؟“

”نہیں حضور۔ پہلے کبھی نہیں پڑا۔ ۔ ۔“

نسترن بانو حیرت سے میری شکل تک رہی تھی۔ پالکی میں بیٹھتے وقت

میں نے فیض الحسن کو آواز دی۔ وہ دوڑا آیا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ حجرے میں میری واپسی کا انتظار کرے۔

”یہ تو۔ ۔ ۔ یہ تو غائب ہو گئے تھے حضور۔ ۔ ۔“ بقال نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ”آتے جاتے رہتے ہیں۔ بے قراروں کو سکون کہاں نصیب۔“

”جی حضور!“ وہ سعادت مندی سے سر ہلا کر رہ گیا۔

”اور ہاں۔ ۔ ۔ یہاں کہیں تلسی بھی اگتی ہے؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”جی حضور بہت اگتی ہے، تالاب کی طرف۔“

”ڈھیر سارے پودے اکھڑوا کر ساتھ لیتے چلو۔ اگر تالاب راستے ہی میں پڑتا ہو۔“

”جی بہت اچھا۔“

کہاروں نے پالکی اٹھائی اور قصبے کی طرف چل پڑے۔ پالکی کے پیچھے نسترن بانو کی ڈولی تھی۔ رسول بخش پالکی کے ساتھ ساتھ دوڑ رہا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد اُس نے کہا۔

”حضور یہاں۔ ۔ ۔ تلسی کے پودے۔“

”بس تو پھر پالکی اور ڈولی یہیں رکھوا کر کہاروں سے کہو کہ پودے اکھاڑ لیں۔“

ڈولی پالکی کے برابر ہی رکھ دی گئی اور رسول بخش کہاروں کے ساتھ تلسی کے پودے اکھاڑنے چلا گیا۔ ادھر شاید نسترن بانو کے پیٹ میں چوہے کود رہے تھے۔ ڈولی کا پردہ ہٹا کر بولی۔ ”یہ سب کیا کھڑاگ پھیلا دیا تم نے۔ یہ تلسی

کے پودے کیوں ؟"

"شیخ سدّو کو کھلاؤں گا " میں نے کہا۔

"کہیں بھد نہ ہو جائے "

" جیسی بھد تیرے معاملے میں ہوتی تھی ؟ " میں نے کہا۔

" خیر دیکھوں گی "

" دیکھے گی کیا۔ شیخ سدو کا باپ بھی میرے علاقے میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ یہ دوسرا معاملہ ہے "

" اچھا اچھا . . . ناکامی کا سامنا کرنے کے بعد کے لئے بھی کو غدر سوچ رکھنا "

" تو بھی کچھ کرے گی یا سب کچھ میں ہی کرتا رہوں گا ؟ "

"تمہارا تو کچھ نہ کچھ ضرور کروں گی۔ اگر اس کا شیخ سدو نہ اتار سکے "

"تو بھی مجھے شیخ سدو ہی کے گھرانے کی معلوم ہوتی ہے "

" زبان کو لگام دو۔ اگر کسی نے ہماری گفتگو سن لی تو مزہ آجائے گا"

تھوڑی دیر بعد وہ تلسی کے پودوں کا گٹھر لیے ہوئے واپس آ گئے۔ اور ہمارا سفر دوبارہ شروع ہو گیا۔ قصبے میں میری پالکی پہنچی تو لوگ گھروں سے نکل آئے۔ پہلی بار میں نے بستی میں قدم رکھا تھا۔ وہ لوگ بے حد خوش تھے اور متحیر بھی۔ پھر جب انہیں معلوم ہوا کہ بقّال کی بہو پر شیخ سدّو آگیا ہے۔ تو تماشائیوں کی حیثیت سے اس کے گھر کے آس پاس اکٹھے ہونے لگے۔ گویا میرا اور شیخ سدّو کا معرکہ دیکھنا چاہتے تھے۔

بقال کی بہو بار بار برہنہ ہو جاتی تھی، اس لئے اسے ایک کوٹھڑی میں

بند کر دیا گیا تھا۔

میں اور نسترن بانو کوٹھری کے دروازے کے قریب جا کھڑے ہوئے اور آس پاس کسی کو بھی نہ رہنے دیا۔ میں نے نسترن بانو سے کہا کہ وہ تلسی کی پتیاں ڈنٹھلوں سے الگ کرائے اور انہیں سِل پر پسوا ڈالے۔

"کیا کرنے جا رہے ہو ؟ "

"تلسی کی پتیاں پسوا کر اسے پلواؤں گا اور اسی کا لیپ اس کے سارے جسم پر کیا جائے گا "

" شروع کر دیں بیوقوفی کی باتیں " وہ آہستہ سے بولی " تم حکیم نہیں ہو، معالج روحانی ہو۔ اگر یہ کوئی مرض بھی ہے تو ان پر قطعی ظاہر نہ ہونے دو "

" پھر میرے آنے کا فائدہ ہی کیا "

" تم جو کچھ بھی کہو گے، کروں گی۔ پتوں کا لیپ بھی ہو جائے گا اور اسے پلوا بھی دوں گی، لیکن تم شیخ سدو ہی کو للکارتے رہنا "

بات عقل کی کہی تھی اس نے۔ غور کرنا ہی پڑا۔ واقعی میں کوئی طبیب تو تھا نہیں، یہ مان دان تو محض اس بنا پر تھا کہ وہ لوگ مجھے کوئی خدارسیدہ آدمی سمجھتے تھے۔ غالباً وہ ٹھیک ہی کہتی تھی کہ میری حیثیت بنائے رکھنے میں اسی کا ہاتھ ہے۔ اگر عین وقت پر سجھائی نہ رہے تو میں ڈوب ہی جاؤں۔ بس، میں نے کوٹھری کے دروازے پر ہاتھ مار کر اونچی آواز میں کہنا شروع کیا۔ " او شیخ سدو۔ او بے حیا۔ تجھے جرأت کیسے ہوئی کہ ہمارے علاقے میں قدم رکھ سکے۔ ابھی تیرا قلع قمع کرتے ہیں . . . . یا مرشد المدد "

نسترن بانو چپکے سے کھسک گئی۔ . . . شاید تلسی کی پتیاں لپوانے گئی تھی۔ میں شیخ سدّو کو للکارتا رہا۔ "او بے حیا، شیخ سدّو . . . کتنی بار ہمارے ہاتھوں سے پٹ چکا ہے، پھر بھی باز نہیں آتا۔ رہ تو جا اس بار تجھے سبز کفن میں لپیٹ کر دریا برد کریں گے۔"

بقال اور اس کے اہلِ خاندان دور کھڑے تھے۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ میں ان کی طرف رخ کر کے کھڑا ہو گیا کہ ان میں ایک ماہ لقا بھی نظر آئی تھی۔ اگر سبز دوپٹے والی وہی تھی تو فیض الحسن اپنی دیوانگی میں حق بجانب تھا۔ خود میرے دل میں گدگدیاں ہو اٹھی تھیں۔ جشن ایٹ میں تو کسی کی جانب بھی خصوصی توجہ نہیں دے سکا تھا۔ اب جو غور سے اسے دیکھا تو تالو خشک ہونے لگا اور کنپٹیاں چٹخنے لگیں۔ پتہ نہیں نام کیا ہے، اس گلعذار کا . . . میں نے رسول بخش بقال کو اشارے سے اپنے قریب بلایا۔ اور بولا "اپنی بیٹی کو یہاں سے ہٹا لے جا۔ کہیں شیخ سدّو بھاگتے بھاگتے اس پہ وار نہ کر جائے۔"

"بہت اچھا حضور۔" وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"اور ہاں . . . ٹھہر . . . کیا نام ہے اس کا؟"

"مہرو، حضور۔"

"کسی سے منسوب ہو چکی ہے۔"

"نہیں حضور۔"

"ہم سے مشورہ کئے بغیر کسی سے منسوب نہ کیجیو۔"

"جیسا حکم حضور . . ."

"بس جا۔ اسے پڑوس میں کہیں بھجوا دے اور ہاں تلسی کی پتیاں جلد از جلد

لاتی جائیں۔"

وہ چلا گیا اور میں پھر کوٹھری کی طرف منہ کر کے شیخ سدّو کو للکارنے لگا۔ "اب بھاگ کر کہاں جائے گا بے حیا۔ آج تیری ایسی دُرگت بنائیں گے کہ پھر کبھی اس بستی کا رخ نہ کر سکے، سبز کفن تیار ہو رہا ہے تیرے لئے۔" اندر بقال کی بہو چیخنے لگی۔ شاید پھر کھجلی کی لہر اٹھی تھی۔ کبھی اندر سے دروازہ پیٹتی اور کبھی گھر والوں کو پکارنے لگتی۔

اتنے میں نسترن بانو تلسی کی پسی ہوئی پتیاں لے کر آ گئی اور میں نے اس سے پوچھا "کیا تو تنہا اسے قابو میں کر کے اس کا لیپ اس کے جسم پر کر سکے گی۔"

"مجھ سے یہ کام نہ ہو گا۔" وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"تو پھر کیا میں لیپ کروں گا۔ آج ہی جوتے بھی کھلوا دینے کا ارادہ رکھتی ہے کیا؟"

"آہستہ بولو . . ."

"مدد کے لئے دو توانا عورتیں بھی ساتھ لے لے، اس کے بغیر کام نہیں چلے گا۔" میں نے کہا۔

"تم خود ہی بقال سے کہو کہ میری مدد کے لئے دو عورتیں فراہم کر دے لیکن مجھے یقین نہیں ہے کہ کوئی اس پر تیار ہو، سبھی سہمی ہوتی ہیں۔"

نسترن بانو کا خیال غلط نہیں تھا۔ بڑی دشواریوں سے بستی کی عورتیں اس کا ہاتھ بٹانے پر تیار ہوتی تھیں۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ میں تو موجود ہوں۔ پھر وہ کیوں ڈرتی ہیں، شیخ سدّو کو اتنا ہوش ہی نہیں رہے گا کہ بقال کی بہو کو چھوڑ کر کسی اور پر حملہ آور ہو سکے۔

بہر حال وہ کسی نہ کسی طرح اندر گئی تھیں۔ میں نے دروازے پر ہاتھ رکھ کر ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بُدبُدانا شروع کر دیا تاکہ دور سے دیکھنے والوں کو معلوم ہو کہ میں کچھ پڑھ رہا ہوں۔

اندر سے دھینگا مشتی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ۔ ۔ لیکن پھر جلد ہی سکوت طاری ہو گیا۔ شاید نسترن بانو نے دونوں عورتوں کی مدد سے اسے قابو میں کر لیا تھا۔ مجھے یقین تھا جیسے جیسے تلسی کا لیپ ہو گا جلد پر ٹھنڈک پڑتی جائے گی۔ کھجلی کم ہو گی اور مریضہ کی بے قراری اور بے چینی میں بھی کمی آتی جائے گی۔ میں نے بقال کو پھر اشارے سے اپنے قریب قریب بلایا۔ وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے آگے بڑھ آیا۔ بُری طرح کانپ رہا تھا۔

"اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں" میں نے اسے تسلی دی "وہ قابو میں آ گیا ہے لیکن یاد رکھ، آج سے تیرے گھرانے میں مسور کی دال بالکل نہ آئے"

وہ حیرت سے میری شکل تکنے لگا۔

"گرہ میں باندھ لے یہ نصیحت مسور کی دال بالکل بند، اور بھی دالیں ہیں دُنیا میں"

"بہت اچھا حضور"

"لوگوں کو نہیں معلوم کہ شیخ سدو بھی مسور کی دال پر پلا ہے۔ کسی کو کھاتے دیکھ کر اس کی رال ٹپکنے لگتی ہے۔ اگر وہ رال اس آدمی کے برتن میں ٹپک گئی جو کھا رہا ہوتا ہے تو بس آ گیا اسی پر شیخ سدو"

"میں بند کرا دوں گا حضور۔ اب کبھی نہیں پکے گی، لیکن حضور"

وہ ہاتھ جوڑ کر بولا "ابھی یہ بات قصبے والوں کو نہ معلوم ہونے پائے"

"کونسی بات؟"

"یہی مسور کی دال والی۔ اگر قصبے والوں کو معلوم ہو گیا تو وہ بھی کھانا چھوڑ دیں گے"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہو گی"

"میرا بڑا نقصان ہو جائے گا حضور۔ دس بوریاں بھری رکھی ہیں۔ میں تو برباد ہو جاؤں گا"

"اگر یہ بات ہے تو واقعی ابھی اس کا اعلان نہ ہونا چاہیئے"

"ہاں حضور۔ اس کے بعد میں خریدوں گا ہی نہیں۔ پھر آپ بتا دیجئے گا سب کو"

"اچھی بات ہے۔ ابھی کھانے دے قصبے والوں کو مسور کی دال۔ ارے ہاں، مہرو کو کہاں چھوڑ آیا"

"جی پڑوس میں"

"جمعرات کی جمعرات درگاہ میں بھیج دیا کر۔ ہمیشہ کے لئے مضبوطی ہو جائے گی۔ بلاؤں سے محفوظ رہے گی"

"بہت اچھا حضور۔ وہ ضرور حاضری دے گی۔ میں خود لایا کروں گا"

تھوڑی دیر بعد نسترن بانو ان دونوں عورتوں کے ساتھ کوٹھری سے برآمد ہوئی "بھاگ گیا؟" اس نے بے حد مسرت کے ساتھ مجھے اور بقال کو اطلاع دی۔

"بلوا بھی وہی تھی نا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، لیکن بڑی دشواری ہوئی تھی اور اب تو وہ گہری نیند سو رہی ہے۔"

"سو گئی؟" بقال نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں سو رہی ہے۔ اسے قطعی نہ جگایا جائے۔ نیند پوری کر کے خود ہی اٹھے گی۔ کوٹھری میں کوئی مرد نہ جائے، صرف عورتیں دیکھنے کے لئے جا سکتی ہیں کہ وہ جاگ تو نہیں پڑی۔"

"اور ہاں۔ یہ بھی سُن۔" میں نے بقال سے کہا۔ "جب جاگے تو صندل کے پانی سے غسل دلوا دیجیو۔ ابھی سے صندل گھسوا کر رکھ لے۔"

"بہت اچھا حضور"

اس قضیئے سے نپٹ کر باہر نکلے تو مکھیا ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ "اب قصبے میں تشریف آوری ہوئی ہے تو غریب خانے پر بھی قدم رنجہ فرمائیے۔"

میں نے نسترن بانو کی طرف دیکھا اور وہ تڑ سے بولی۔

"ہاں ہاں۔ کیا حرج ہے۔ ضرور چلیں گے۔ تم سے زیادہ اور کون ہو سکتا ہے۔ وہ تو اس قابل ہی نہیں تھی کہ درگاہ تک جا سکتی۔ اس لئے میاں صاحب کو تکلیف کرنی پڑی۔"

"اور ہم تو خلق خدا کی خدمت ہی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

مہرو کو ایک بار اور دیکھے بغیر وہاں سے ہلنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کی موہنی مورت بار بار آنکھوں میں پھر جاتی تھی۔ کیا کٹیلے ابرو تھے۔ کیا مخمور آنکھیں تھیں اور ہونٹ تھے یا سنگترے کی قاشیں۔۔۔ اور وہ مردود ہونق اس چاند کے ٹکڑے پر عاشق ہوا تھا۔

میں نے بقال کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اب مہرو کو بلا لا۔ اس پر کچھ دم کرتا جاؤں۔۔۔۔ یہ اچھا نہیں ہوا کہ شیخ سُدّو نے تیرا گھر دیکھ لیا ہے۔"

وہ چلا گیا اور میں نے کنکھیوں سے نسترن بانو کو دیکھا تو اسے اپنی ہی جانب آنکھیں پھاڑے نگراں پایا۔۔۔ پھر مکھیا نے دریافتِ حال کے لئے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ بقال کی بہو پر کیا گزری۔

"بس کچھ نہ پوچھو۔" نسترن نے پیشانی پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "رسول بخش کی تقدیر اچھی تھی کہ میاں صاحب نے حجرے سے باہر نکلنا منظور کر لیا۔۔۔ ورنہ وہ تو مر ہی جاتی۔"

اتنے میں بقال مہرو کو لے کر آیا۔ مردوں کے مجمعے میں اس طرح شرماتی لجاتی آئی کہ میرے ہوش و حواس تو بالکل ہی جاتے رہے۔ بڑی مشکل سے خود پر قابو پایا اور آہستہ آہستہ کچھ پڑھنے کے سے انداز میں ہونٹ ہلانے لگا۔ پھر اس پر پھونکیں مار کر بولا۔ "بس لے جا۔ خدا نے چاہا تو یہ بالکل محفوظ رہے گی۔ اور ہاں جب تیری بہو خود سے جاگے تو ہمیں اس کے احوال سے آگاہ کیجیو۔"

بڑی بے دلی سے روانگی ہوئی۔ اب میری پالکی اور نسترن کی ڈولی مکھیا کی حویلی کی طرف جا رہی تھی۔ دیوان خانے میں مجھے اتارا گیا اور نسترن بانو زنانخانے میں چلی گئی۔

مکھیا ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "حضور اگر کچھ حرج نہ ہو تو دوپہر کا کھانا یہیں تناول فرمائیں۔"

"کوئی مضائقہ نہیں۔ تمہارا کہنا تو ہم کسی طرح ٹال ہی نہیں سکتے۔"

"میری خوش نصیبی ہے حضور۔"

"اور ہاں، ہمارا وہ شاگرد جس نے درخت سے الٹے لٹک کر مجاہدہ

کیا تھا۔ وہ پھر واپس آگیا ہے۔ اس کا کھانا خانقاہ ہی میں بھجوا دینا۔"

"بہت بہتر حضور۔ وہ کہاں چلے گئے تھے۔"

"سیلانی آدمی ہے لیکن اب ہم اسے ایسا باندھیں گے کہ ہل بھی نہیں سکے گا اپنی جگہ سے۔ ہمیں حکم ہوا ہے کہ اسے تعلیم کریں اور اس قابل بنا دیں کہ ہمارے بعد خلقِ خدا کی خدمت کر سکے۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہوگی حضور۔"

"ہمیں اس علاقے سے محبت ہوگئی ہے ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے بعد بھی اس کا کوئی رکھوالا نہ رہے۔"

"کرم۔ کرم۔ ۔ ۔ حضور۔ ۔ ۔ !"

تھوڑی دیر بعد دسترخوان بچھا دیا گیا تھا۔ مکھیا نے گاؤں کے کچھ اور لوگوں کو بھی کھانے کے لئے روک لیا تھا، لیکن میرا دل اب اس میں بھی نہیں لگ رہا تھا کہ لوگ میرے آگے پیچھے جا رہے ہیں۔ بار بار آنکھوں میں مہرو کی صورت پھر جاتی تھی اور فیض الحسن پر غصہ آنے لگتا تھا۔

کھانے سے فراغت کے بعد مکھیا نے درخواست کی کہ تھوڑی دیر وہیں آرام بھی کر لوں۔ دراصل میری بھی یہی خواہش تھی کیونکہ دوپہر کے کھانے کے بعد مجھ سے ہلا بھی نہیں جاتا تھا۔ لیکن لیٹ جانے کے بعد غنودگی بھی نہیں آنے پائی تھی کہ عجیب طرح کا شور سنائی دیا۔ چونک کر اٹھ بیٹھا۔ حویلی کے اندر بھی شور ہو رہا تھا اور باہر سے بھی شور سنائی دے رہا تھا۔

میں دیوان خانے میں تنہا رہ گیا تھا۔ کس سے پوچھتا کہ کیا ہو رہا ہے خود اٹھ کر باہر جانا شایانِ شان نہیں تھا۔ اسی حیص بیص کے عالم میں بیٹھا تھا کہ نسترن بانو افتاں وخیزاں دیوان خانے میں داخل ہوئی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے۔" میں اس کے چہرے پر سراسیمگی کے آثار دیکھ کر گھبرا گیا۔

"ہنومان گڑھی والوں نے چڑھائی کر دی ہے۔" وہ ہانپتی ہوئی بولی۔

"تو تجھے اتنی پریشانی کیوں لاحق ہوگئی ہے؟"

"کہار بھاگ نکلے ہیں۔"

"بھاگ جانے دے۔"

وہ اور قریب آکر آہستہ سے بولی۔ "تم نہیں جانتے اگر ان کی جیت ہوگئی تو سب سے پہلے حویلی ہی زد میں آئے گی۔ لوٹ مار کر کے آگ لگا دیں گے۔ عورتوں کی بے عزتی کریں گے۔"

یہ سنتے ہی میرا عرب خون جوش میں آگیا ہے اور اٹھتا ہوا دہاڑا۔ "کیا بکتی ہے۔ ہماری زندگی میں یہ ناممکن ہے کہ کوئی اس حویلی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھ سکے۔"

"بس بس۔ بیٹھے رہو۔ ۔ ۔" وہ برا سا منہ بنا کر بولی۔ "یہ شیخ سدو نہیں ہے کہ تلسی کی پتیوں کے لیپ سے بھاگ جائے گا۔ باہر خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔"

"لا۔ ایک تلوار مجھے لا دے۔" میں نے خونخوار لہجے میں کہا۔

"بہت زیادہ اترانے کی ضرورت نہیں ہے۔ چپ چاپ بیٹھے رہو۔"

"نسترن اس وقت تو نے اپنی بات اونچی رکھنے کی کوشش کی، تو زندگی بھر پچھتائے گی۔"

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا لیکن اس بار میرا مضحکہ نہ اڑا سکی کیونکہ میں نے جو کچھ بھی کہا تھا، پوری سنجیدگی کے ساتھ کہا تھا۔

"تجھے معلوم ہوگا کہ مکھیا کا اسلحہ خانہ کہاں ہے، نہ معلوم ہو تو مکھیا کی بیوی سے کہہ کر مجھے ایک تلوار لا دے۔"

وہ دم بخود کھڑی مجھے دیکھتی رہی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کی قوت فیصلہ جواب دے گئی ہو۔

ٹھیک اسی وقت مکھیا کی بیوی دیوان خانے میں داخل ہوئی بہت خوفزدہ معلوم ہوتی تھی آتے ہی جھک کر سلام کیا اور دریافتِ حال پر گڑگڑانے لگی۔

"خدا ہی عزت رکھے ہم امن و امان سے رہنے والے لوگ ہیں۔ ہنومان گڑھی والے پاگل ہوگئے ہیں۔"

"لیکن انہوں نے چڑھائی کیوں کی ہے؟"

"خدا ہی جانے۔ ہم پر کوئی الزام نہیں ہے۔ سنا ہے انہوں نے حال ہی میں دو ترک ملازم رکھے ہیں۔ سارا کیا دھرا انہیں ترکوں کا ہے، ورنہ ہنومان گڑھی والے تو صرف پوجا پاٹ کرنے والوں میں سے ہیں۔ انہیں لڑائی بھڑائی سے کیا کام۔ جب سے یہ دونوں ترک آئے ہیں، آس پاس کی جاگیروں پہ چڑھائی کرتے رہتے ہیں۔ گھروں میں آگ لگا دیتے ہیں اور بستیوں میں لوٹ مار کرتے ہیں۔"

"جلال الدین محمد اکبر کے دور میں ایسا اندھیر" میں نے غضبناک ہو کر کہا "وہ خدا کو کیا منہ دکھائے گا۔"

"میں نے سنا ہے کہ ان ترکوں کے ڈر سے کوئی بات دربار تک پہنچنے

ہی نہیں پاتی۔" مکھیا کی بیوی نے کہا۔

"اب پہنچے گی۔ مجھے ایک تلوار لا دے۔"

"ہاں۔ ظلم کے خلاف انہیں بھی تلوار اٹھانے کی کوشش کرنی چاہیئے جو تنکوں کا بوجھ بھی نہ سہار سکتے ہوں۔ میں دیکھوں گا ان ترکوں کو۔"

"میاں صاحب، یہ حرب و ضرب کے معاملات ہیں۔" نسترن بانو نے دخل اندازی کی اور میں اسے قہر آلودہ نظروں سے گھورتا ہوا بولا۔

"بی بی صاحبہ ہم پر جو احوال گزرتے ہیں۔ ان سے تم بھی پوری طرح واقف نہیں ہو اور ہم مغل ہیں، عرب ہیں، ہر عرب پیدائشی جنگ جو ہوتا ہے۔ خواہ اسے حرب و ضرب کے رموز سے آگاہی ہو یا نہ ہو، مناسب یہی ہوگا کہ تم اس معاملے میں دخل نہ دو۔ ہم اپنے دوست کو مصیبت میں دیکھ کر خاموش نہیں بیٹھ سکتے۔"

نسترن بانو نے منہ بھلا کر سر جھکا لیا۔ مکھیا کی بیوی کی موجودگی میں اس انداز کی بکواس نہیں کر سکتی تھی، جیسے عموماً میرے سلسلے میں کرتی ہی رہتی تھی۔

دفعتہً ایک زخمی آدمی دیوان خانے میں گھس آیا۔ مکھیا کے سپاہیوں میں سے معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اطلاع دی کہ مکھیا زخمی ہوگیا ہے، لیکن حملہ آوروں کے مقابلے میں ڈٹا ہوا ہے۔ مکھیا کی بیوی نے سسکنا شروع کر دیا۔

"تو بھی تو زخمی ہے۔" میں نے سپاہی سے کہا۔ "لا اپنی تلوار مجھے دے۔"

"آپ۔۔۔ تلوار۔۔۔!" وہ ہکا بکا رہ گیا۔

"جلدی کر۔" میں ڈپٹ کر بولا۔ اور اس نے بوکھلا کر تلوار میرے حوالے

کردی۔

"تلوار لے کر میں دروازے کی طرف جھپٹا ہی تھا کہ نسترن بانو، مجھ سے پہلے ہی دروازے پر پہنچ گئی اور میری راہ روک کر آہستہ سے گھگیائی "میری بات مان لو۔ مت جاؤ۔ میں قسم کھاتی ہوں کہ اب تمہیں پریشان نہیں کروں گی، تمہاری ہر بات مانوں گی۔"

میں اسے دھکا دے کر باہر نکل آیا۔ میرا صحرائی خون جوش مار رہا تھا۔ اپنے آپے میں نہیں رہا تھا۔ تیر کی طرح اُدھر ہی نکلا چلا گیا۔ جدھر سے شور سنائی دے رہا تھا۔ . . اور پھر ٹھیک اسی جگہ جا پہنچا جہاں یہ ہنگامہ برپا تھا۔ غنیم قصبے والوں پر دباؤ ڈال رہا تھا اور وہ پیچھے ہٹ رہے تھے۔ کہ میں نے نعرہ بلند کر کے کہا "مت گھبرانا ہم آگئے ہیں"

انہوں نے میرے ہاتھ میں تلوار دیکھی تو خود بھی نعرے لگا لگا کر غنیم پر ٹوٹ پڑے۔ بالکل ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے اچانک سوتے سے جاگ پڑے ہوں۔ بحالتِ پسپائی ان کا یہ حملہ غنیم کے لئے بوکھلا دینے والا ثابت ہوا اور اب وہ پیچھے ہٹنے لگے۔ میں صفوں کو چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ عجب سی وحشت ذہن پر طاری تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے مجھ پر کشت و خون کا دورہ چڑھ گیا ہو۔ میرے اس انداز نے قصبے والوں کا مزید دل بڑھایا اور وہ بڑی بے جگری سے لڑنے لگے۔

دفعتہً مجھے حملہ آوروں میں ایک جانی پہچانی سی شکل نظر آئی . . . پھر ایک اور آدمی شناسا سا معلوم ہوا۔ کہیں انہیں دونوں ترکوں کا ذکر تو نہیں کیا تھا، سکھیا کی بیوی نے۔

میں نے ان دونوں کو پہچان لیا۔ یہ قطب قلی خان کے ان ساتھی

رہزنوں میں سے تھے، جن کی نالائقی کی بنا پر میں "پیر و مرشد" بن گیا تھا۔ میں نے ان دونوں کو للکارا۔ بدبختو۔ کیوں جہنم کا ایندھن بنتے ہو۔ توبہ کر کے پھر گنا ہوں کی دلدل میں جا پھنسے۔ اب ہم تمہیں فنا ہی کر دیں گے۔"

انہوں نے مجھے شمشیر بکف دیکھا تو حیران رہ گئے۔ ایک کے ہاتھ سے تو تلوار ہی چھوٹ پڑی اور دوسرے نے چیخ چیخ کر اپنے ساتھیوں سے ہاتھ روک لینے کو کہنا شروع کر دیا۔ اور میں دونوں حریفوں کے درمیان ہاتھ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ فی الفور لڑائی رک گئی تھی اور دونوں جانب کے لڑاکے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھ رہے تھے . . . پھر اچانک دونوں قزاق خالی ہاتھ ہو کر میرے قدموں پر آگرے اور گڑگڑانے لگے۔

"یا حضرت! ہمیں علم نہ تھا کہ آپ یہاں تشریف فرما ہیں۔ ہمیں معاف کر دیجئے۔"

"میں نے کڑک کر کہا "تم اپنی توبہ سے پھر گئے"

"توبہ سے تو نہیں پھرے۔ ملازمت کر رہے ہیں اور اپنے مالک کے حکم کی بجا آوری کر رہے تھے، لیکن ہمیں اگر علم ہوتا کہ یہاں والے آپ کے زیر سایہ زندگی بسر کر رہے ہیں تو ہرگز ادھر کا رُخ نہ کرتے۔"

قصبے والے حیرت سے منہ کھولے کھڑے تھے۔

. . . .

اُدھر ہوا یہ کہ جیسے ہی یہ خبر قصبے میں مشہور ہوئی کہ "اُبٹن شاہ" بھی تلوار کھینچ کر غنیم پر جا پڑے ہیں تو بچّہ بچّہ جوش میں بھرا ہوا گھر سے نکل پڑا۔ وہ بوڑھے جو لبِ گور ہو رہے تھے، وہ بھی لٹھیا ٹیکتے اور غنیم پر سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے میدانِ کارزار میں آ پہنچے۔

مُکھیا کسی قدر زخمی ہوگیا تھا۔ دونوں قزّاقوں کو میری پابوسی کرتے دیکھ کر آگے بڑھا اور انہیں اٹھا اٹھا کر بغلگیر ہوتا ہوا بولا "ارے تم تو پیر بھائی ہو ہمارے۔ سب کچھ تمہارا ہے، جو دل چاہے لے جاؤ۔"

"ہم شرمندہ ہیں، بھائی" اُن میں سے ایک بولا۔ "اب اور شرمندہ نہ کرو۔ نادانستگی میں ہم سے جو غلطی سرزد ہوئی ہے، اس کے لئے جو سزا چاہو دے لو۔ ہم سے حرفِ شکایت نہ سُنو گے۔"

تکلّفات کے اس تبادلے میں خاصا وقت گزر گیا۔ آخر خدا خدا کر کے قزّاقوں کی وہ ٹولی وہاں سے رخصت ہوئی۔

قصبے والوں کا یہ عالم تھا کہ میرے آگے پیچھے جا رہے تھے۔ ایسا لگتا

تھا جیسے پہلی بار مجھے دیکھا ہو۔ مُکھیا کی حویلی میں واپسی ہوئی۔ نسترن بانو پل پل کی خبریں منگواتی رہی تھی۔ میرے سامنے آئی تو ایسی حالت میں کہ چہرہ سُتا ہوا تھا۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں اور خاموشی سے مجھے ایسے انداز میں دیکھے جا رہی تھی کہ لاکھوں شکوؤں سے بھری ہوئی ہو۔ لیکن بھلا ہو اُس بھیڑ بھاڑ کا ورنہ کبھی کی پھٹ پڑی ہوتی۔

مجھے یقین تھا کہ آج رات بھر سونے نہ دے گی۔ میں بڑی تھکن محسوس کر رہا تھا۔ جسمانی مشقت کا عادی نہیں رہا تھا۔ اتنی بھاگ دوڑ کرنی پڑی تو جی نڈھال ہوگیا اور اب تو لیٹ ہی جانا چاہتا تھا لیکن آرام کہاں۔ واپسی میں پالکی اور ڈولی کے پیچھے ایک اژدھام چلا۔ خانقاہ میں پہنچ کر بھی پل بھر کے لئے لیٹنا نصیب نہ ہوا۔ بدبخت، قوال بھی ساتھ لاتے تھے۔ میرے گرد حلقہ کر کے بیٹھ گئے اور میں ذہنی انتشار کو کم کرنے کے لئے جھومنے لگا۔

پہلے کچھ دیر سرگوشیاں ہوئیں اور پھر طبلے پر تھاپ پڑی۔ قوالی شروع۔ ایسا جھلا جھلا کر جھُوما ہوں کہ بس۔ . . لیکن قوالی دیر تک جاری نہ رہ سکی۔ کیونکہ نسترن بانو کو غصہ آگیا تھا۔ اُس نے مُکھیا کو للکار کر کہا "بس اب ختم کرو۔ میاں صاحب کو تو ہوش نہیں ہے اور تم لوگ پاگل ہوگئے ہو۔ خاصانِ خدا بھی پتھر کے بنے ہوتے نہیں ہوتے۔ انہیں بھی آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔"

اس للکار کے ساتھ ہی قوالی رُک گئی اور لوگ ایک ایک کر کے اُٹھنے لگے۔ اور میرا خون خشک ہونے لگا کہ تخلیہ ہوتے ہی میری شامت آجائے گی۔ سب چلے گئے لیکن فیض الحسن اپنی جگہ سے نہ ہٹا۔ نسترن بانو، جھپٹ کر زنانہ حجرے سے برآمد ہوئی لیکن فیض الحسن کو دیکھ کر پہلے تو ٹھٹکی پھر غُرّائی "تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ چلو جاؤ اپنے ٹھکانے پر۔" ٹھکانے سے

مراد مزار شریف کا سائبان تھی۔ وہ وہیں پڑا رہتا تھا۔ بیچارہ چپ چاپ اٹھا اور رخصت ہوگیا۔

نسترن نے دروازہ بند کرکے کنڈی لگائی اور کمر پہ دونوں ہاتھ رکھے مجھے گھورتی رہی انداز ایسا ہی تھا جیسے باقاعدہ کشتی لڑنے کا ارادہ رکھتی ہو۔ میں نے بھی اپنی آنکھیں قہر آلود بنانے کی کوشش کی۔

"میں نے قسم کھائی تھی کہ تمہیں ماروں گی" وہ بالآخر بولی۔

"کیا بکواس ہے"

اُس نے آگے بڑھ کر ہاتھ گھما دیا۔ میں نے سر پیچھے ہٹایا لیکن پھر بھی چھچلتا ہوا ہاتھ پہ پڑ ہی گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ مجھے سچ مچ غصہ آگیا۔ چُٹیا تھام کر جھٹکا دیا تو تیورا کر فرش پہ آگری اور پھر جو میں نے اُسے لاتوں اور گھونسوں پہ رکھا ہے تو "اَرے اَرے" کے علاوہ اور کچھ بھی نہ اُس کے منہ سے نکل سکا۔

پھر وہ کسی نہ کسی طرح چھوٹ بھاگی اور زنانہ حجرے میں گھس کر اندر سے کنڈی لگالی۔

"کھول دروازہ۔ آج تجھے زندہ نہ چھوڑدں گا"

ٹھیک اسی وقت شاید فیض الحسن نے بیرونی دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

میں نے جھپٹ کر دروازہ کھولا۔ فیض الحسن ہی تھا۔ میرا غصّہ اور تیز ہوگیا۔ گریبان تھام کر اُسے اندر کھینچ لیا اور پھر جو مارا ہے دھوبی پاٹ تو دھڑام سے فرش پہ آگرا۔

"ارے . . . ارے . . . !" بدقت تمام اُس کی زبان سے نکل سکا۔

میں اُس کے سینے پر سوار ہوگیا تھا اور گالوں پر تھپڑ مارے جا رہا تھا۔ وہ دیکھنے میں ہٹا کٹا معلوم ہوتا تھا لیکن انتہائی قوت صرف کرنے کے باوجود بھی مجھے اپنے اوپر سے نہ ہٹا سکا۔

آخر بے بسی سے چیخنے لگا "مرجاؤں گا پیرو مرشد۔ ارے . . . . میرا قصور . . . میرا قصور بھی تو بتایئے"

"ولدالحرام۔ خانقاہ کو عشق بازی کا اڈا بنائے گا۔ زندہ نہ چھوڑوں گا تجھے . . . ." میں ہانپتا ہوا بولا اور میرے ہاتھ چلتے رہے۔

"ارے . . . ارے . . . پہلے ہی کیوں نہیں" وہ جملہ پورا کئے بغیر ہی خاموش ہوگیا۔ ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ آنکھیں بند ہوگئیں جبڑے سختی سے بھنچ گئے۔

اچانک نسترن بانو اپنے حُجرے کا دروازہ کھول کر نکلی اور بوکھلا کر بولی "ارے کیا مار ہی ڈالا"

میں اُسے چھوڑ کر ہٹا اور حجرے سے باہر آگیا۔

دوسرے دن بھی ہمارے درمیان بول چال قطعی بند رہی لیکن وہ ڈھیٹ فیض الحسن اب بھی موجود تھا۔ اُس پہ اس مار پیٹ کا بالکل اثر نہیں ہوا تھا۔ البتہ مجھ سے نظر نہیں ملاتا تھا۔ بی بی صاحبہ کی خدمت گزاریوں میں لگا رہا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس خبیث سے کسی نہ کسی طرح پیچھا چھڑانا ہی چاہیئے۔

دونوں بدبختوں نے میرے سامنے ہی بیٹھ کر ناشتہ کیا تھا۔ مجھے پوچھا تک نہیں۔ میں آنکھیں بند کئے جھومتا رہا۔ پھر نسترن حسب معمول قصبے کی طرف چلی گئی اور فیض الحسن مزار کے قریب جا بیٹھا۔ بھوک کے مارے بُرا حال تھا میرا۔ لیکن کیا کرتا کہ وہ ظالم بچا کھچا ناشتہ بھی اپنے ساتھ ہی سمیٹ کر لے

گئی تھی۔

میں نے حجرے سے نکل کر فیض الحسن کو آواز دی۔ جہاں بیٹھا تھا، وہیں سے بولا۔ "یا حضرت میں اُس وقت تک آپ کے قریب نہیں آؤں گا، جب تک بی بی صاحبہ واپس نہیں آجاتیں۔"

میں ایک دَم بھڑک کر بولا "کیا ہم خود تیرے پاس نہیں پہنچ سکتے؟"

"یا حضرت، آپ مجھ سے زیادہ تیز نہیں دوڑ سکیں گے۔" اس نے جواب دیا اور میں غصّے میں اپنی ہی بوٹیاں نوچتا رہ گیا۔

"ناشتہ کہاں ہے؟" میں نے کچھ دیر بعد غُرّا کر پوچھا۔

"ناشتے دان بی بی صاحبہ کے ساتھ ہی واپس گیا۔"

بھوک کے مارے دَم نکل رہا تھا۔ سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کروں حجرے میں کچھ بھی نہیں تھا جس سے پیٹ کی آگ بجھائی جا سکتی۔

"ہمارے لئے کہیں سے بھی کچھ فراہم کر۔ . . !" میں نے گرج کر کہا۔

"میں کہاں سے فراہم کروں۔"

"ہمارے قہر کو نہ للکار . . ."

"میں تو گڑگڑا رہا ہوں۔ عاجزی کر رہا ہوں یا حضرت . . . !" وہ سہم کر بولا۔

"ناشتہ . . . فوراً . . . ورنہ غارت کر دیں گے، تجھے۔"

میں نے دیکھا کہ وہ جلدی جلدی اپنی گٹھڑی کھول رہا ہے۔ گٹھڑی سے ایک پوٹلی نکالی اور وہیں سے مجھے دکھا کر بولا "یہ تھوڑے سے بُھنے چنے ہیں میرے پاس۔"

"یہی لے آ۔" میں نے بے چینی سے کہا لیکن وہ مردود پوٹلی کو فرش پہ رکھتا ہوا بولا۔ "یہ رکھی ہوئی ہے۔"

اور پھر چھلانگ لگا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ وہ سرپٹ دوڑتا چلا جا رہا تھا۔

میں نے وہاں سے پوٹلی اٹھائی اور حجرے میں آ بیٹھا۔ بڑے مزے کے لگ رہے تھے۔ خستہ کرارے چنے، لیکن نسترن بانو کے خلاف غصّہ بدستور برقرار رہا تھا۔ ساتھ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ فیض الحسن خواہ مخواہ پٹ گیا اور اس کا یہ عالم ہے کہ شکل دیکھ کر ہی بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔

نسترن بانو بھی فیض الحسن سے سخت متنفر تھی، لیکن اس واقعے کے بعد سے دونوں میں گاڑھی چھن رہی ہے مجھے جلانے کے لئے یا واقعی دونوں ایک دوسرے کے لئے ہمدردی محسوس کرنے لگے تھے۔ کہیں یہ نسترن کوئی اور گل نہ کھلائے، کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھے کہ میری بے وقعتی ہو جائے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ آخر فیض الحسن اور اس کے درمیان اس سلسلے میں کیا باتیں ہوئی تھیں۔ کسی طرح معلوم ہونا چاہیئے اور یہ کام اس کی واپسی سے پہلے ہی ہو جائے تو بہتر ہے، ورنہ پھر موقع نہ ملے گا۔ لیکن وہ مردود تو میری شکل دیکھتے ہی بھڑک جاتا ہے۔

چنوں کی مقدار زیادہ نہیں تھی، لیکن ایک پیالہ پانی پینے کے بعد کسی قدر تسکین ہو گئی اور میں اٹھ کر پھر حجرے کے دروازے پر آ کھڑا ہوا۔ فیض الحسن سائبان کے نیچے بیٹھا دکھائی دیا۔ بُری طرح ہانپ رہا تھا . . . لیکن دیکھ رہا تھا حجرے کی طرف۔ دفعتہً پھر اٹھا لیکن میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "بس کر ہم نے تجھے معاف کر دیا۔"

"لیکن یا حضرت مجھ سے قصور کیا ہوا تھا؟" اس نے رونی آواز میں پوچھا۔

"ہمیں بحالتِ جلال دیکھ کر ہم سے دور رہا کر۔ ۔ ۔"

"پتہ بھی تو چلے جلال و جمال کا۔"

"بس ختم کر یہ باتیں اور ہمارے قریب آ۔ ۔ ۔"

اُس کے انداز سے ہچکچاہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔ پھر اس طرح میری طرف بڑھنے لگا جیسے پیچھے سے کوئی دھکیل رہا ہو۔

میں پیچھے ہٹ کر اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔ ۔ ۔ وہ دروازے ہی میں کھڑا ہو گیا۔ ۔ ۔

"اندر آ کر بیٹھ جا" میں نے کہا۔

بیٹھ تو گیا لیکن مطمئن نہیں معلوم ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی وقت بھی اُٹھ کر بھاگ کھڑا ہو گا۔

"تجھے یہ بتانا تھا کہ وہ بھی خطرے میں ہے۔" میں نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔

"کک۔ ۔ ۔ کون۔ ۔ ۔ !"

"سرو۔ ۔ ۔ ہو سکتا ہے آپ کے شیخ سندو اس پر آ جائے۔"

"کک کیوں؟" اس نے بیوقوفوں کی طرح منہ پھاڑ دیا۔

"یہ شیطان تو گھر دیکھ ہی لیتا ہے۔ ایک کو چھوڑ دوسرے کو جکڑا۔"

"یہ تو بہت بُرا ہو گا یا حضرت۔ ۔ ۔"

"ہمیں خوش رکھے گا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"میری جان آپ پر قربان، میں تو کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کرتا جو آپ کی ناراضگی کا باعث ہو۔ کل جو کچھ بھی نادانستگی میں ہوا، بی بی

صاحب نے مجھے اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔"

"کل تو بتایا ہی ہو گا اس واقعے کے بعد۔ ۔ ۔"

"جی ہاں، بہت کچھ بتایا تھا۔ ۔ ۔"

"کیا بتایا تھا۔ ۔ ۔ ؟"

"یہی کہ بحالتِ جلال۔ دخل اندازی نہ کرنا چاہیے اور یہ بھی کہا تھا کہ جب ایسی حالت طاری ہوتی ہے تو کئی کئی روز تک نہ کھانا کھاتے ہیں اور نہ پانی پیتے ہیں لیکن حکم ہے کہ جو کچھ کھاؤ پیو ہمارے سامنے بیٹھ کر کھاؤ پیو، البتہ ہم سے کھانے پینے کو نہ کہنا۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے بے دلی سے سر ہلا کر کہا اور سوچنے لگا کہ کم بخت مجھے بھوکا مارنے پر تُل گئی ہے شاید۔

فیض الحسن عجیب نظروں سے میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔

"ہاں، ہم ایسے ہی ہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس بار یہ کیفیت زیادہ دیر تک طاری نہیں رہی۔ تو نے دیکھا کہ ہم نے تجھ سے بھنے ہوئے چنے لے کر کھائے ہیں۔"

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

"کیا سمجھ میں نہیں آتا؟"

"سمجھ میں آ جائے تو بتا نہ دوں کہ کیا سمجھ میں نہیں آتا۔"

"اچھا، تو ایک بات یاد رکھ کہ اگر یہاں کے راز کسی پر افشا کئے تو کتے کی موت مر جائے گا۔" میں اُسے گھورتا ہوا بولا۔

"راز۔ ۔ ۔ کیسے راز۔ ۔ ۔ ؟" وہ پھر بھڑک گیا۔

"جو کچھ بھی تجھے یہاں نظر آئے، اُسے راز ہی سمجھ۔ یہاں کی ایک بات

بھی باہر نہ جانے پاتے۔ ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں، اُس کے باطن تک کوئی بھی
نہیں پہنچ سکتا۔"
"میں کچھ نہیں سمجھا پیر و مُرشد۔ ۔ ۔"
"کل ہم نے تجھے زندہ کیوں چھوڑا۔ بہ حالتِ جذب تیرا خاتمہ بھی کر
سکتے تھے۔"
"بے شک، بے شک۔" وہ سر ہلا کر بصدِ خلوص بولا۔
"یہی مشیتِ ایزدی تھی کہ تجھ سے ایک تقدیر اور بھی وابستہ ہے۔"
"کس کی تقدیر؟"
"مہرو کی۔ ۔ ۔"
"ارے نہیں؟" وہ حیرت سے اچھل پڑا۔
"ادب ملحوظ رکھ۔ ۔ ۔" میں نے آنکھیں نکالیں۔
"معافی چاہتا ہوں یا حضرت۔ اُس کا نام مجھ پر جو کیفیت طاری کرتا ہے
بیان نہیں کر سکتا۔"
"آسمانوں پر فیصلہ ہو چکا ہے۔"
"ک ک۔ ۔ ۔ کس بات کا؟"
"تم دونوں کے ملاپ کا لیکن ہماری زوجہ اُسے پسند نہیں کرتی۔"
"م۔ میری بدنصیبی۔"
"وہ اس حد تک بھی جا سکتی ہے کہ تجھے ہمارے خلاف بھڑکانا شروع
کر دے۔"
"میں نہیں بھڑکوں گا یا حضرت۔" وہ گھگھیایا۔
"کبھی کبھی پتھر میں بھی جونک لگ جاتی ہے۔"

"آپ میرے لئے دُعا فرمایئے کہ میں آپ کا دامن نہ چھوڑوں۔"
"اُسے ہرگز نہ بتانا کہ میں نے تجھ سے چنے لے کر کھائے ہیں۔"
"ہرگز نہیں حضورِ والا۔" اس نے کہا، لیکن اس کی آنکھوں میں اُلجھن کے
آثار تھے۔
"اس کی کوئی اہمیت نہیں، صرف تیرا امتحان مقصود ہے۔ اگر پیٹ کا
ہلکا نکلا تو مہرو تیرے ہاتھ نہیں آئے گی۔"
"میں اپنا پیٹ ہی پھاڑ ڈالوں گا۔ اگر میں نے یہ محسوس کیا کہ یہ بات
میرے پیٹ میں نہیں رُکے گی۔"
"ٹھیک ہے۔ جا اور اپنے ٹھکانے پر بیٹھ۔"
"لیکن یا حضرت، وہ شیخ سدو والی بات۔ ۔ ۔"
ہنسی آجاتی۔ اگر ضبط نہ کرتا۔ کم بخت چاہتا تھا کہ مہرو کی بات کچھ دیر
اور جاری رہے۔
"چل۔ ۔ ۔ جا۔" میں نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ "یہ ہمارا اور شیخ سدو کا معاملہ
ہے تجھے کیا پڑی ہے۔"
"حضور۔ ۔ ۔ وہ مہرو۔ ۔ ۔"
"جاتا ہے یا پھر مجھے جلال آجائے۔" میں نے آنکھیں نکالیں اور ٹھنڈی
سانس لے کر اٹھ گیا۔
زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سنائی دیں۔
کوئی اِدھر ہی آرہا تھا۔ پھر فیض الحسن کچھ بدحواس سا اندر داخل ہوا۔
"دو۔ سوار آرہے ہیں یا حضرت۔ ۔ ۔" اس نے کہا۔
"آرہے ہوں گے۔ جا بیٹھ اپنی جگہ پر۔" میں نے ہاتھ ہلا کر کہا اور

جھومنے لگا۔

وہ باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد پھر آکر بولا "وہ باریابی چاہتے ہیں یا حضرت"

"آنے دے لیکن تو باہر ہی ٹھہر"

وہ چلا گیا۔ نہ جانے کیوں اتنا بدحواس نظر آرہا تھا۔ تشویش تو مجھے بھی ہوئی تھی کہ دونوں سوار کون ہیں۔ قصبے والے پیدل ہی خانقاہ تک آتے تھے۔ جلد ہی تشویش رفع ہوگئی۔ آنے والے وہی دونوں قزاق تھے۔ جنہوں نے پچھلے دن قصبے پر چڑھائی کی تھی۔

میں نے آنکھوں کی جنبش سے بیٹھ جانے کا اشارہ کیا اور وہ مؤدب ہوکر دوزانو بیٹھ گئے۔

"کیوں آئے ہو؟" میں نے اپنی آواز میں جلال پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"قدم بوسی کو حاضر ہوتے ہیں پیرو مُرشد" ایک بولا۔

"پیرو مُرشد نہ کہو۔ تم نے ہماری اطاعت سے مُنہ موڑا اور دوبارہ رہزنی شعار کی"

"ہم نوکری کر رہے ہیں اور مالک کا حکم بجالاتے ہیں"

"قطب قلی خان کی بھی تو نوکری ہی کر رہے تھے"

"وہ نوکری نہیں تھی یا حضرت، وہ ہمیں مالِ غنیمت میں سے حصّہ دیا کرتا تھا"

"ایک ہی بات ہے۔ اَب تم ایک قزاق کے نوکر ہو"

"ہم ہنومان گڑھی کے راجہ دلیپ سنگھ کے نوکر ہیں یا حضرت"

"ہمیں علم ہے کہ وہ دلیپ سنگھ قزاق ہے۔ کیا یہ قزاقی نہیں کہ کسی

کی زمین دباتا ہے اور کسی کے باغ پر قبضہ کر لیتا ہے، اگر کوئی دربار تک شکایت پہنچانے کی کوشش کرتا ہے تو حادثاتی موت کا شکار ہو جاتا ہے ہمیں خوب معلوم ہے کہ وہ حادثات کیونکر وقوع پذیر ہوتے ہیں"

"پھر ہم کیا کرتے یا حضرت، قطب قلی خان کو جو عورت آپ نے عنایت کی تھی، وہ اُسے دربار تک لے گئی۔ ہمیں کیا دیا آپ نے"

"تم دونوں کے نکاح میں بھی دو عورتیں آئی تھیں"

"بالکل فضول ثابت ہوئی ہیں"

"کیوں، کیا ہوا؟"

"نہ کام کاج کی ہیں اور نہ طالع یاور کی مالک؟"

"اس لئے تم نے ایک ڈاکو کی نوکری کر لی اور بھول گئے کہ توبہ کر چکے ہو"

"اگر آپ کی نظرِ کرم ہو جائے تو سب ٹھیک ہو سکتا ہے" اس نے میری طرف جُھک کر آہستہ سے کہا۔

"اَب ہم سے کیا چاہتا ہے؟" میں نے اسے گھور کر پوچھا۔

"کل آپ نے بقال کی بہو کا شیخ سَدو اُتارا تھا"

"ہاں۔ تو پھر۔ ۔ ۔ ؟"

"اگر آپ کوشش فرمائیں تو راجہ دلیپ سنگھ مشرّف بہ اسلام بھی ہو سکتا ہے"

"شیخ سدو سے راجہ کے مشرّف بہ اسلام ہونے کا کیا تعلق"

"یہ ایک بہت بڑا راز ہے پیرو مرشد پچھلی رات راجہ نے صرف ہم پر ظاہر کیا ہے۔ وہ ہم آپ کے گوش گزار کرنا چاہتے ہیں"

"ٹھہرو" میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا "ہمیں راز دار بنانے کی ضرورت نہیں۔ ضروری نہیں کہ جو تم دونوں چاہتے ہو۔ میں اس پر تیار ہی ہو جاؤں گا"

"ہم بڑی آس لے کر حاضر ہوتے تھے یا پیر و مرشد"

"اگر ہمیں اس راز میں شریک کرنا چاہتے ہو تو کان کھول کر سن لو کہ بعد کی درخواست اگر قابلِ قبول ہوئی تبھی ہمارے پاس آنا بار آور ہو سکے گا۔ ورنہ نہیں"

"آپ سن لیجئے۔ معاملہ شیخ سندو والے معاملے سے مختلف نہیں ہے۔ ہماری عزت رہ جائے گی اور آپ کا مرتبہ غیر مسلموں کی نظروں میں بلند ہوگا۔ کیا عجب ہے کہ کچھ لوگ دینِ حق بھی قبول کر لیں۔ آخر یہاں اسلام آپ ہی جیسی برگزیدہ ہستیوں ہی کی وجہ سے تو پھیل رہا ہے۔"

اس کی یہ بات سن کر میں نے سکوت کیا اور دل ہی دل میں اپنے آپ پر لعنت کرنے لگا۔ کیا میں ایسا ہی ہوں۔ یہ کم بخت کن اعلیٰ و ارفع ہستیوں سے مجھ شیطان کا جوڑ ملا رہا ہے اور پھر مجھے اُن دونوں پر غصہ آنے لگا۔ یہی قزاق تو تھے جن سے جان بچانے کے لئے پہلے پہل جھوٹ بولا تھا اور ان بدعقیدہ لوگوں نے مجھے بانس پر چڑھا دیا تھا۔ خداوندا اب میں اس جنجال سے کیسے نکلوں۔ کس منہ سے ایک عالم کو آگاہ کر دوں کہ میں بالکل خالی ہوں۔ سب ڈھونگ ہے۔ پھر اگر کبھی ہمت کر کے اظہارِ حقیقت پر آمادہ بھی ہوا تو اُن کے ہاتھوں میرا کیا حشر ہوگا، جو اب تک میرے قدموں پر سر جھکاتے رہے ہیں۔ مجبوری۔ . . . خداوندا میں کیا کروں۔ میں نے سر اٹھا کر اُن کی طرف دیکھا۔ وہ ملتجیانہ نظروں سے مجھے دیکھے جا رہے تھے۔

میں نے کہا "بیان کرو"

ایک قزاق طویل سانس لے کر بولا "ہنومان گڑھی والوں کے خاندان میں ایک راج مکٹ زمانۂ قدیم سے چلا آ رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شری رام چندر جی نے اُسے ہاتھ لگا کر دُعا دی تھی کہ جس گھرانے میں یہ راج مکٹ جا رہا ہے، وہ قیامت تک باقی رہے گا"

"بکواس. . . " میں بڑبڑایا "قیامت تک کوئی گھرانا برقرار نہیں رہ سکتا"

"مطلب یہ کہ نسل قائم رہے گی"

"چلو، آگے چلو" میں نے بیزاری سے کہا۔

"پس ہوا یہ کہ جب بھی ہنومان گڑھی کا کوئی نیا راجہ گدی پر بیٹھتا ہے تو یہ راج مکٹ ذرا دیر کو اس کے سر پر رکھ دیا جاتا ہے۔ پچھلے سال اچانک وہ راج مکٹ غائب ہو گیا، جو ہزاروں سال سے اس خاندان میں چلا آ رہا تھا اور جس کے بغیر نئے راجہ کی گدی نشینی باضابطہ نہیں تسلیم کی جا سکتی . . ."

"ٹھہر جا. . . !" میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا "میرے پاس کیوں آیا ہے، حاضرات کے کسی عامل کو تلاش کیا ہوتا"

"بڑی دشواریاں ہیں پیر و مرشد۔ ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی"

میں نے سر کی جنبش سے بیان جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔

"وہ تاج راجہ کے چچا جیون سنگھ کی تحویل میں تھا۔ وہی اس کا محافظ تھا۔ تاج غائب ہوتے ہی اُس کا دماغ الٹ گیا۔ سادھوؤں اور جوگیوں کا کہنا ہے کہ اس پر بھیروں کا سایہ ہو گیا ہے"

"ہوں۔ تو انہوں نے کچھ نہیں کیا اُس کے لئے"

"نہیں، پیرومُرشد . . . "

"تاج پہلے غائب ہوا تھا یا پہلے بھیروں کا سایہ ہوا تھا اُس پر ؟" میں نے پوچھا۔

"سایہ ہو جانے کے بعد ہی راجہ جی کو تاج کی فکر ہوئی تھی۔ تبھی معلوم ہوا کہ وہ غائب ہو گیا ہے۔ راجہ کے چچا اپنے ہوش ہی میں نہیں ہیں۔"

"تاج کے غائب ہو جانے سے کسی کو کیا نقصان پہنچے گا ؟"

"راجہ دلیپ کا بیٹا جاگیر سے محروم ہو جائے گا اور جاگیر دھرم شالے اور مندروں میں چلی جائے گی۔"

"تاج کے غائب ہو جانے سے راجہ کے چچا کو بھی کچھ فائدہ پہنچ سکے گا یا نہیں ؟"

"فائدہ ہی فائدہ یا حضرت کیونکہ دھرم شالوں اور مندروں کا منتظم وہی ہے۔"

"لیکن یہ بھیروں کیا چیز ہے ؟"

"خدا ہی جانے . . . یا دیوتا ہو گا یا کوئی راکھشش۔ ویسے یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بھیروں کا نام سنتے ہی جوگی اور سادھو کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں۔ کوئی بھی اس کے قریب جانے کی جرأت نہیں کرتا۔"

"راجہ کا کیا خیال ہے ؟"

"وہ تو اُسے ڈھونگ ہی سمجھتا ہے، لیکن چچا کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔"

"پھر تم ہم سے کیا چاہتے ہو ؟"

"جب آپ شیخ سدّو اتار سکتے ہیں تو بھیروں سے بھی نپٹ لیں گے۔"

"شیخ سدّو سے ہم نے فارسی میں نپٹا تھا۔ ہندی سے قطعی نابلد ہیں۔"

"آپ ہمیں مایوس نہ فرمائیں۔ اگر بات ہمارے ہی توسط سے بن گئی تو ہماری اہمیت بھی بڑھے گی اور ہم ایک ایک شادی اور کر لیں گے۔"

"جزاک اللہ۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"تو پھر آپ کرم فرمائیں گے ؟"

"شاید . . . لیکن محض اس لئے کہ ہم بھیروں سے بھی جان پہچان پیدا کرنا چاہتے ہیں۔"

"جب آپ فرمائیں ہم حاضر ہو جائیں۔"

"تمہاری حاضری سے کیا ہو گا۔ اُسے لے آؤ۔"

"راجہ جی کے چچا کو یہاں لے آنا امرِ محال ہو گا۔"

"پھر کیسے بات بنے گی۔ ہم تو یہاں سے ہل بھی نہیں سکتے۔"

"وجہ پوچھنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔" اس نے بڑی عاجزی سے کہا "لیکن . . ." پھر وہ جملہ پورا کئے بغیر خاموش ہو گیا۔

"حضرت شاہ لولوائی کا حکم نہیں ہے کہ ہم یہاں سے ہلیں بھی۔"

"لیکن یا حضرت کل تو آپ قصبے میں تشریف لے گئے تھے۔"

"بے شک ہم گئے تھے، لیکن شیخ سدّو کے لئے نہیں بلکہ قصبے والوں کو تمہاری دستبرد سے بچانا مقصود تھا۔"

"تو آپ کو پہلے سے علم ہو گیا تھا کہ ہم لوگ قصبے پر چڑھائی کریں گے۔"

"حضرت شاہ لولوائی نے ہمیں خواب میں آگاہ فرما دیا تھا اور یہ بھی حکم دیا تھا کہ ہمیں کیا کرنا ہے، اس لئے یہی سمجھیں گے کہ یہ غیر معمولی

نقل و حرکت انہی کے حکم سے ہوتی تھی۔"

"ہمیں حضرت شاہ لولوائی کا پتہ بتا دیجئے تاکہ ہم ان کی خدمت میں حاضری دے کر سفارش حاصل کریں۔"

"ان کی خدمت میں حاضری کے لئے تجھے مرتبہ شہادت پر فائز ہونا پڑے گا۔"

"میں نہیں سمجھا یا حضرت۔"

"وہ دُنیا سے پردہ کر چکے ہیں۔"

"میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں پیر و مُرشد۔" وہ بوکھلا کر بولا۔

اِدھر میں سوچ رہا تھا کہ کیوں نہ موقعے سے فائدہ اٹھاؤں۔ یہاں سے تو اچانک فرار ناممکن تھا لیکن ہنومان گڑھی سے کسی جانب نکل جانا بڑی بات نہ ہوگی۔ ظاہر ہے نسترن بانو تو ساتھ جاتے گی نہیں، لیکن کیا وہ مجھے جانے دے گی۔ ہر چند کہ فی الحال تعلقات خراب ہو گئے تھے، لیکن اُس کا کیا ٹھیک، ہو سکتا ہے۔ خود بخود من جاتے اور اس سفر میں روڑا اٹکانے کی کوشش کرے۔ کچھ دیر مزید غور و فکر کرنے کے بعد میں نے اُس سے کہا۔

"ہم اپنے مُرشد شاہ لولوائی سے ان کی رضا حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔"

"تو پھر ہم کب حاضر ہو جائیں؟"

"کل اسی وقت اور سواری کے لئے پالکی یا رتھ لے آنا۔"

"ایسا ہی ہوگا پیر و مرشد۔"

وہ خوش خوش واپس چلے گئے۔ شاید اس دوران میں فیض الحسن کے پیٹ میں چوہے کود رہے تھے۔ اُن کے رخصت ہوتے ہی دوڑا آیا، لیکن مجھ

سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ مُنہ لٹکائے کھڑا رہا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے ڈپٹ کر پوچھا۔

"مم۔ میں نے . . . ان لوگوں کو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

"تو نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے۔"

"صورت سے خونناک لگ رہے تھے۔"

"جہنم کے فرشتے تھے۔" میں نے جھلّا کر کہا۔ "جا بیٹھ اپنے ٹھکانے پر۔"

بُرا سا منہ بناتے ہوئے واپس چلا گیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس کا تذکرہ نسترن بانو سے ضرور کرے گا۔ شاید اس طرح وہ خود بخود سیدھی ہو جاتے۔ میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ باہر کے باہر ہی فیض الحسن نے اُسے جڑ دیا۔ وہ اندر آئی اور ذرا فاصلے پر کھڑی ہو کر مجھے گھورنے لگی۔ میں نے بیزاری ظاہر کرنے کے لئے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

"کون لوگ آتے تھے؟" اس نے بے حد سرد لہجے میں پوچھا اور میں آنکھیں بند کر کے جھومنے لگا۔ وہ خاموش کھڑی شاید مجھے گھورے جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد دانت پیس کر بولی۔ "میں سمجھتی ہوں . . . وہی دونوں حرام خور قزاق ہوں گے۔"

"تو کہاں کی حلال خور ہے کہ انہیں حرام خور کہہ رہی ہے۔" میں نے ڈپٹ کر کہا اور آنکھیں کھول دیں۔

"کیوں آتے تھے وہ؟"

"اپنے کام سے کام رکھ . . . !"

"کیا تم آہستہ نہیں بول سکتے۔" وہ مڑ کر دروازے کی دیکھتی ہوئی

بولی ۔ اُسے بھی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ کہیں کوئی ایسی ویسی بات فیض الحسن کے
کان میں نہ پڑ جائے ۔
" نہیں، میں آہستہ نہیں بول سکتا ۔ ابھی تو نے دیکھا ہی کیا ہے ۔ ذرا قصبے
والوں کا مجمع ہونے دے، پھر دکھاؤں گا تجھے اپنے کمالات ۔"
" کوئی بے وقوفی کی حرکت نہ کر بیٹھنا ۔" یک بیک وہ کسی قدر سیدھی ہوتی ہوئی
نظر آئی اور میں نے مزید اکڑ جانا مناسب سمجھا ۔
" سر سے کفن باندھ لیا ہے اب تو ۔" میں نے کہا ۔
" کیا کرو گے قصبے والوں کے مجمعے . . . "
" تیرا پول کھول دوں گا ۔"
" میرا یا اپنا ۔" وہ طنز آمیز ہنسی کے ساتھ بولی ۔
" صرف تیرا ۔ مجھے تو بے ہوش کر رکھا ہے تو نے ۔ جتنا پہلے معصوم تھا،
اُتنا ہی اب بھی ہوں ۔"
" بات پلّے نہیں پڑی، میاں جی ؟ "
" میں نہیں جانتا تو کون ہے ۔"
" ہوئی نا بے وقوفی کی بات ۔"
" تیری سمجھ کا پھیر ہے ۔ اس سے زیادہ عقلمندی کی بات میں نے پہلے
کبھی نہ کی ہوگی ۔"
" بات معلوم بھی تو ہو ۔"
" بس ایک چھوٹی سی کہانی سنانی پڑے گی ۔ قصبے والوں کو پھر وہ سب
مل کر تجھے زندہ دفن کر دیں گے ۔"
یہ حربہ کام کر گیا ۔ یعنی وہ باقاعدہ سر ہو گئی ۔ اُس کی دانست میں میرے

بے وقوف ہونے میں کوئی کلام نہیں تھا ۔ تو پتہ نہیں میری حماقت مآبی میری زبان
سے کیا نکلوا دے کہ سچ مچ اُس کی گردن کٹ جائے ۔
" تم ذرا ذرا سی بات پر برانگیختہ ہونے لگے ہو ۔" وہ کسی قدر خوشامدانہ لہجے
میں بولی ۔
" یہ ذرا ذرا سی بات تھی کہ تم نے مجھ پر ہاتھ چھوڑ دیا ۔" میں نے آنکھیں
نکالیں اور وہ مڑ کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی ۔ پھر اسی پر بس نہیں کی ۔
دروازے تک گئی اور اچھی طرح اطمینان کر لیا کہ فیض الحسن قریب تو نہیں ہے ۔
اس کے بعد میرے قریب آ کر بولی ۔" تم نے بھی تو بدلہ لے لیا تھا ۔ پھر اس
طرح منہ پھلا کر بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے ؟"
" سوال تو یہ ہے تُو نے ایسی حرکت کی ہی کیوں تھی ۔ ؟ "
" تمہیں اتنا بُرا لگا ۔"
" کیوں ؟ بُرا کیوں نہ لگتا ؟ "
پیار سے مجھے دیکھتی رہی پھر بولی " چونکہ تم بہت زیادہ غصے میں تھے ۔
اس لئے میں نے مناسب نہیں سمجھا تھا کہ رات کا کھانا کھاؤ ۔ معدہ بالکل
چوپٹ ہو جاتا ہے، اگر بحالتِ غصہ کھایا جائے ۔"
" اور ناشتہ ۔" میں نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا ۔
" اگر ناشتے کو پوچھتی تو تمہیں پھر غصہ آ جاتا ۔"
" اب دماغ کیوں کھا رہی ہو ؟ "
" تم قصبے والوں کے سامنے اپنا اور میرا وقار برقرار رکھو گے ۔"
" میں تو بے حد معصوم بن کر اُس کہانی میں جلوہ افروز ہوں گا ۔"
" آخر بتاتے کیوں نہیں کیا کہو گے ؟ "

میں نے سکوت اختیار کیا۔ آنکھیں بند کیں اور پھر جھُومنا شروع کر دیا۔

"اچھا۔ . . اچھا۔ . ." وہ ہنس کر بولی "میں بات نہیں بڑھانا چاہتی ورنہ اس وقت بھی غصّہ آگیا تو کھانا نہیں کھا سکو گے۔"

اُس کی اس بات پر اس زور کا غصّہ آیا کہ بیان سے باہر ہے، لیکن اظہار نہ کر سکا۔ کیا حرفوں کی بنی ہوئی عورت ہے۔ شیطان بھی پناہ مانگے۔

دوپہر کے کھانے میں اُس نے فیض الحسن کو شریک نہیں کیا۔ اس کا کھانا وہیں سائبان کے نیچے پہنچا آئی۔ حجرے میں دسترخوان بچھا کر کھانا رکھ دیا۔ اور مجھے متوجہ کرنے کی کوشش کرنے لگی، لیکن میں بیٹھا جھُومتا رہا۔

"بس ختم بھی کرو۔ . . آجاؤ۔ . . !" وہ ٹھنک کر بولی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور اُسے اِس طرح دیکھنے لگا جیسے پہلی بار اُس کی آواز سُنی ہو۔

"آؤ۔ آجاؤ" وہ ہاتھ ہلا کر بولی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کسی ننھے سے بچّے کو بُلا رہی ہو۔

بھوک بہت زور سے لگ رہی تھی، اس لئے مزید اُلجھنا بیکار سمجھ کر کھانے پر ٹوٹ پڑا اور وہ بڑی سنجیدگی سے بولی "مجھے اس پر قطعی افسوس نہیں کہ میں نے تمہیں مارا تھا۔" میں ہاتھ روک کر اُسے گھورنے لگا۔

"کھاتے رہو" وہ سر ہلا کر بولی "آنکھیں نکالنے کی ضرورت نہیں۔ اگر میں تمہیں نہ مارتی تو تم بھی مجھے اتنی بے دردی سے نہ پیٹ سکتے۔ . ."

"اچھا تو پھر۔ . . ؟"

"پھر کیا۔ اب میں سوچ رہی ہوں کہ مجھے تم سے باقاعدہ طور پر نکاح کر ہی لینا چاہیئے۔"

میں کھانا چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ خُدا کی پناہ کیا چیز ہے یہ عورت؟ حیرت سے میری آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں، اس لئے نکاح کرنا چاہتی ہے کہ میں نے اسے پیٹ کر رکھ دیا تھا۔ جتنے لقمے حلق سے اُتار چکا تھا، وہ سب نکل آنے پر زور لگانے لگے۔

نسترن بانو بھی اُٹھ کھڑی ہوئی اور میرا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھا دینے کی کوشش کرتی ہوئی بڑے پیار سے بولی "چین سے بیٹھ کر کھا لو۔ بچّوں کی طرح اُچھل کوُد مت مچاؤ۔"

میرے جسم سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ پھُوٹ رہا تھا۔ میں نے کسی سحرزدہ آدمی کے سے انداز میں اُس کے اس مشورے پر عمل کیا یعنی پھر بیٹھ کر پیٹ کا دوزخ بھرنے لگا۔ اب اُس سے آنکھیں ملانے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ کھانے کے اختتام پر پھر بڑے پیار سے بولی "اب بیٹھ کر جھُومنا مت شروع کر دینا۔ تھوڑی دیر آرام بھی کر لیا کرو۔ سچ مچ تمہیں جھُومنے کی عادت پڑ گئی ہے۔"

"لیکن۔ . . ن۔ . . نسترن بانو" میں ہکلا کر رہ گیا۔

"کیا بات ہے۔ . . !"

"یہ شش شادی وادی کی بات۔ . . !"

"کیوں کیا ہوا؟ یہ تو بہت پہلے ہو جانا چاہیئے تھا۔ اب عقل آگئی ہے۔"

"میں اس پر تیار نہیں ہوں۔ . ."

"ارے واہ۔ . . تمہارے تیار ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ میری خواہش اور میری تجویز ہے۔ . ."

"یعنی میری مرضی کو دخل ہی نہیں ہے اس میں" میں نے حیرت سے کہا۔
ابھی تک اپنی حالت پر قابو نہیں پا سکا تھا۔ زمین و آسمان چکراتے ہوئے
لگ رہے تھے۔

"بالکل نہیں۔ باوا آدم کو ماما حوّا کی مرضی کا پابند ہونا پڑا تھا۔ یہی قدرتی
بات ہے۔ باوا آدم تو بھاگے بھاگے پھرتے تھے۔ ڈرتے تھے کہ کہیں حکم خداوندی
کے خلاف کوئی فعل سرزد نہ ہو جاتے۔"

"ماما کو شیطان نے بہکایا تھا۔ . . ." میں نے تھوک نگل کر کہا۔

"براہِ راست باوا آدم کو تو نہیں بہکا سکا تھا۔ تم اس سے انکار نہیں
کر سکتے کہ خدا کے بعد ماما حوّا کے آگے سر جھکا دینا باوا آدم کی سرشت
تھی۔"

"کیا بکواس کر رہی ہے" مجھے تھوڑا تھوڑا غصّہ آنے لگا تھا۔

"جہالت کی باتیں مت کرو، اگر وہ آدم کی فطرت نہ ہوتی تو ماما حوّا اُن
سے کبھی خدا کی نافرمانی نہ کرا سکتیں۔"

"تیری باتیں مجھے پاگل بنا دیں گی۔"

"واقعی بالکل جاہل ہو۔ اتنی ذرا سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔ مرد
کے لئے اوپر خدا ہے اور زمین پر عورت۔ اس کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔
اُسے خدا سے ڈرنا اور عورت کے اشارے پر چلنا چاہیئے۔ . . . تم نے اپنے
باپ کا دودھ پی کر دانت نہیں نکالے تھے۔ وہ ایک عورت ہی تھی جس نے
تمہیں زندہ رکھا۔ وہ اپنا کام ختم کر چکی۔ اب دوسری عورت کا کام شروع
ہوگا۔ یہی فطرت ہے اور یہی خدا کی حکمت ہے۔"

میں حیرت سے آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھے جا رہا تھا۔ دفعتہً [illegible]

لے کر بولا "دیکھ نسترن بانو! ہو سکتا ہے تو سچ کہہ رہی ہو۔ لیکن وہ عورت تو
نہیں ہو سکتی۔ ہرگز نہیں۔"

"میری توہین نہ کرو" وہ غرائی۔

پھر مجھے یاد آ گیا کہ ایک بار خود میں نے بحالتِ غنودگی اس سے کہا تھا۔
کہ مجھ سے شادی کر لے کہ دونوں کا اس طرح تنہا رہنا خلافِ شریعت ہے
لیکن اس نے بڑی حقارت سے میری اس تجویز کا مضحکہ اُڑا دیا تھا۔ میں نے
اُسے یہ بات یاد دلائی۔

"ہوں۔ مجھے یاد ہے" وہ لاپروائی سے بولی۔

"تو پھر اب مجھ میں کون سے سُرخاب کے پر لگ گئے ہیں"

"کوئی بھی نہیں۔ جتنے اُلّو پہلے تھے۔ اُتنے ہی اب بھی ہو"

"اور تو اُلّو سے شادی کرے گی؟" میں نے پھاڑ کھانے والے لہجے
میں پوچھا۔

"یہی ہوتا ہے" وہ بڑی متانت سے بولی "شادی سے پہلے ہر مرد
اُلّو ہوتا ہے۔ عورت ہی اُسے آدمی بناتی ہے"

بیحد غضبناک تھی میری ہنسی۔ خود میرے کان جھنجھنا اٹھے، لیکن زبان
سے کچھ نہ نکل سکا اور پھر میں فیض الحسن کو آواز دینے لگا تھا۔

"یہ . . . یہ . . . کیا کر رہے ہو" وہ آنکھیں نکال کر بولی۔

"اُسے بتاؤں گا کہ وہ بھی اُلّو ہے" میں نے قہر آلود لہجے میں کہا۔

"حاضر ہوں . . . یا حضرت!" باہر سے فیض الحسن کی آواز آئی۔

وہ مجھے گھورتی ہوئی اٹھی اور دروازہ کھول دیا۔

وہ اندر آیا اور اس طرح ہاتھ باندھے اور سر جھکائے کھڑا رہا جیسے

کسی بہت بڑے دربار میں حاضری دے رہا ہو۔

پھر قبل اس کے کہ میں اس سے کچھ کہتا۔ نسترن بول اٹھی "تمہیں کھانے کو کچھ اور تو نہ چاہیئے ؟"

"نہیں بی بی صاحبہ۔ شکم سیر ہو کر کھایا ہے میں نے"

"اچھا دسترخوان بڑھا دو"

پھر وہ برتن سمیٹنے لگا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ آخر میں نے اُسے کیوں آواز دی تھی۔

برتن ایک طرف رکھ کر وہ چلا گیا اور نسترن بانو میری طرف دیکھے بغیر بولی "تم اس معاملے پر سنجیدگی سے غور کرو"

"مجھے کیا ضرورت ہے"

"تمہاری یا تمہارے جواب کی کیا اہمیت ہے۔ جو کچھ میں کہوں گی تمہیں کرنا پڑے گا"

"کیوں شامت آئی ہے تیری" میں اُسے گھونسہ دکھا کر بولا۔

"مجھے اس کی بھی پروا نہیں ہے"

"اچھا کیسے کرے گی شادی ؟" میں نے زچ ہو کر پوچھا۔

"ہم دونوں مل کر اس پر غور کریں گے"

"تو ہی کرتی رہ غور"

"تم بھی کرو گے۔ میں تمہیں اس پر مجبور کر دوں گی" کہتی ہوئی وہ اپنے حجرے میں چلی گئی اور میں ہولے ہولے کراہتا ہوا گاؤ تکیے پر ڈھ گیا۔ معلوم نہیں اب وہ کیا کرنے والی تھی۔ یہاں اس جگہ تو شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ لوگ ہمیں زن و شوہر کی حیثیت سے جانتے تھے۔

مجھ جیسے برگزیدہ آدمی کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ اس طرح میری زندگی گزر رہی ہوگی۔

سوچا تھا کچھ دیر سو رہوں گا کہ پچھلی رات نیند پوری نہیں ہو سکی تھی، لیکن اس نئے قضیئے نے ایک پل کو بھی آنکھ نہ لگنے دی۔

عصر کے وقت وہ حجرے سے نکلی اور وضو کرنے بیٹھ گئی۔ میں اُسے قہرآلود نظروں سے دیکھتا رہا۔ دفعتہً وہ میری طرف مڑ کر بولی "کیا نماز نہیں پڑھو گے ؟"

"پڑھ لوں گا۔ تجھے اس سے کیا ؟"

"تم آخر اتنے اُکھڑے اُکھڑے کیوں ہو ؟"

"میں تجھ سے شادی نہیں کر سکتا"

"آہستہ بولو۔"

"میں پاگل ہو جاؤں گا، ورنہ تو مجھے یقین دلا دے کہ یہ تجویز محض مذاق تھی"

"میری توہین نہ کرو۔ ۔ ۔ ورنہ اُبٹن شاہ سے کیچڑ شاہ بنا دوں گی"

"اچھی بات ہے۔ میں بھی دیکھوں گا"

بعد عصر قصبے والوں کی آمد شروع ہو گئی تھی۔ آج مجمع کچھ زیادہ ہی تھا۔ لوگ خانقاہ کے باہر بھی بیٹھے ہوتے تھے، مکھیا بھی موجود تھا۔ اور میں حسب دستور آنکھیں بند کئے ہوئے بیٹھا جھوم رہا تھا۔ اچانک آنکھیں کھول کر ان کی طرف دیکھتا ہوا بولا "تم لوگ غم نہ کرنا"

وہ سب حیرت سے میری طرف دیکھنے لگے اور مکھیا ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"میں نہیں سمجھا پیر و مرشد"

" ہم پردہ کرنے والے ہیں " میں نے مسکرا کر کہا۔

اُن کے منہ فق ہو گئے۔ ایسا سکوت چھا گیا جیسے اُن میں سے کوئی بھی زندہ نہ ہو۔

" یہ آپ کیا فرما رہے ہیں پیر و مرشد " سکھیا نے گلوگیر آواز میں کہا۔

" ہمیں کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے، یا مر جائیں گے یا تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہو جائیں گے۔ ہماری عدم موجودگی میں ہماری زوجہ کا خیال رکھنا۔"

وہ دہاڑیں مار مار کر رونے لگے اور میں یہ سوچ سوچ کر خوش ہوتا کہ نسترن بانو اپنے حجرے میں بیٹھی دانت پیس رہی ہو گی۔ اپنی بوٹیاں نوچ رہی ہو گی۔

جب گریہ وزاری کا زور کچھ کم ہوا تو میں نے اونچی آواز میں کہا " ہماری پوری بات سُنو۔ ۔ ۔"

وہ دم بخود ہو کر میری شکل تکنے لگے۔ میں نے کہا " جب تک ہماری زوجہ کا حجرہ صحیح و سالم رہے۔ سمجھنا کہ ہم بقید حیات ہیں، لیکن جب کسی رات زوجہ کے حجرے کی چھت گر پڑے اور وہ اُس میں دب کر دُنیا سے سدھارے تو سمجھ لینا کہ ہم بھی اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے ہیں۔"

وہ پھر چیخ چیخ کر رونے لگے اور نسترن بانو تڑپ کر اپنے حجرے سے نکل آئی۔

" خاموش ہو جاؤ۔ ۔ ۔ خاموش ہو جاؤ۔ ۔ ۔" وہ زور سے بولی۔

ایک بار پھر سناٹا چھا گیا اور وہ کہنے لگی " میاں صاحب اس وقت یہاں نہیں ہیں۔ تم انہیں جسمانی طور پر یہاں دیکھ رہے ہو، لیکن حقیقتاً یہ اس وقت اصفہان میں ہیں۔"

کوئی کچھ نہ بولا اور وہ کہتی رہی " معلوم نہیں کس کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں اور تم لوگ آسمان سر پر اٹھائے ہوئے ہو۔ ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے تو یہ اپنے آپ میں نہیں رہتے۔ پچھلے سال جب ہم دلّی میں تھے تو انہوں نے ایسی ہی کیفیت کے تحت مجھے اپنی زوجہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر کہتے تھے کہ یہ ایک بلائے آسمانی ہے جو ہم پر نازل ہو گئی ہے۔ ہماری زوجہ ہرگز نہیں ہے۔ تم لوگ اس سے ہمارا پیچھا چھڑا دو یا اس سے ہمارا نکاح کرا دو۔ پھر جب تک دو بارہ نکاح نہیں پڑھا گیا تھا یہ ہوش میں نہیں آتے تھے۔ سو تم لوگ اب جاؤ۔ اگر کل تک ان پر یہی کیفیت طاری رہے تو قاضی کو لے کر آنا اور ایک بار پھر باقاعدہ ہمارا نکاح پڑھوا دینا۔ یہ اصفہان سے واپس آ جائیں گے۔"

ہائے غضب۔ ۔ ۔ ہائے غضب۔ ۔ ۔ میں دل ہی دل میں اپنا سر پیٹتا رہا۔ چوٹ دے گئی۔ اب کیا ہو گا۔ وہ سب ایک ایک کر کے اٹھنے لگے تھے اور میری زبان گنگ ہو گئی تھی۔ یہ مجھ سے کیا حماقت سرزد ہو گئی۔ کیسی ندامت نے گھیرا تھا اس وقت۔ اب کیا ہو گا؟ اگر واقعی یہ کل قاضی کو لے آئے تو کیا ہو گا؟ ابوالحسن یہ کیا ہو گیا! ارے بدبخت اس نے تو تدبیر بھی کر لی اور خود تو ہی اس کا باعث بن گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے حجرہ خالی ہو گیا۔ انہیں نسترن کی بات پر یقین آ گیا تھا۔

صرف فیض الحسن بیٹھا رہا۔ کبھی میری شکل دیکھتا تھا اور کبھی نسترن بانو کی۔ وہ سراپا اتنی سنجیدہ نظر آ رہی تھی جیسے میں سچ مچ پاگل ہو گیا ہوں۔

" تت۔ ۔ ۔ تو پھر سے نکاح بی بی صاحب۔ ۔ ۔ !" فیض الحسن

گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"ہاں فیض الحسن اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے" نسترن نے مغموم لہجے میں کہا اور پُرتشویش نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے جھلا کر آنکھیں بند کر لیں اور جھومنا شروع کر دیا۔ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا بولوں۔ سوچ رہا تھا کہ بے وقوفی پدر بزرگوار سے ورثے میں ملی تھی۔ آخر اس وقت یہ کھڑاگ پھیلانے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا ہو گیا تھا مجھے؟ میں نے خواہ مخواہ جو بکواس شروع کر دی تھی، اُس کا کیا نتیجہ نکلتا؟ آخر کیا ضروری تھا کہ میں انہیں پہلے سے آگاہ کر دیتا کہ میں اچانک غائب ہو جاؤں گا۔

فیض الحسن کھنکار کر بولا۔ "لیکن بی بی صاحب۔ یہ بڑی عجیب بات ہے"

"شاہ ابوالحسن کے مرتبے سے تُو واقف نہیں ہے۔ تُو نہیں جانتا کہ اس میں کیا راز ہے"

"کیا راز ہے؟"

"کیوں بکواس کر رہا ہے۔ خدائی بھید تجھ پر ظاہر نہیں کیا جا سکتا"

"جی بہت اچھا۔ میں معافی چاہتا ہوں"

"جا بیٹھ اپنے ٹھکانے پر" وہ کڑک کر بولی۔

میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اس موقع پر فیض الحسن کو روکے رکھنا چاہتا تھا لیکن قبل اس کے کہ کچھ کہتا، وہ خانقاہ سے باہر جا چکا تھا۔ نسترن بانو میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور میں پھاڑ کھانے والے انداز میں اسے گھورتا رہا۔

"کیسی رہی میاں صاحب!" وہ ہنس کر بولی۔

اب میں احمقوں کی طرح اُسے تکتے رہنے کے علاوہ اور کر ہی کیا سکتا تھا۔

"تم نے دیکھا۔ میں نہ کہتی تھی کہ ہم دونوں ہی مل کر کوئی تدبیر کریں گے سو ہو گئی تدبیر۔ کل یہ نکاح ہو کر رہے گا"

"میں تمہیں جان سے مار دوں گا"

"نکاح کے بعد تمہارا جدھر جی چاہے چلے جانا اور میں حجرے کی چھت گرنے کا انتظار کرتی رہوں گی"

"نہیں اُس سے پہلے ہی میں تجھے مار ڈالوں گا"

"یہ بھی کر کے دیکھ لو" وہ لاپروائی سے بولی۔

سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ اُسے جان سے مار دینے والی بات محض دھمکی تھی۔ مجھ میں اتنا دَم خم کہاں کہ کسی کو جان سے مار سکوں۔

وہ جان جلانے والے انداز میں کھڑی مسکراتی رہی اور میں دل ہی دل میں اپنی بوٹیاں نوچتا رہا۔

"نکاح کے بعد شیرینی بھی تقسیم ہو گی" نسترن بولی "میں اُن سے کہوں گی کہ اصل اور نقل میں کوئی فرق نہ ہونا چاہئے۔ قصبے سے عورتوں کو بلوا کر اپنے ہاتھوں میں مہندی بھی لگواؤں گی"

"خدا کے لئے خاموش رہ" میں نے بے بسی سے کہا۔

"اوہو۔ کیا اصفہان میں بھی تم میری باتیں سُن رہے ہو!"

"خدا نے چاہا تو آج ہی تیرے حجرے کی چھت گر جائے گی۔"

"بیوہ عورتوں کی طرح کوسنے تو نہ دو" وہ ہنس کر بولی۔

"دیکھ، سچ کہتا ہوں تجھے زندہ نہ چھوڑوں گا۔ اگر تو نے نکاح کا پکّا ارادہ کیا تو..."
چلایا۔

"وہ تو چل چکا ہے۔ میاں صاحب! کل نکاح ہو کر رہے گا اور تم اس خیال کو بھی دل سے نکال دو کہ آج رات کو یہاں سے نکل بھاگو گے۔ میری زندگی میں یہ ناممکن ہے۔"

میں سناٹے میں آگیا۔ کیسی حماقت سرزد ہوئی ہے۔ خود ہی اپنے گرد دیواریں کھڑی کریں۔ آخر اس بکواس کی ضرورت ہی کیا تھی! نکلنا تھا تو چپ چاپ نکل جاتا۔ اب یہ رات بھر جاگ کر نگرانی کرے گی۔ ہائے ابوالحسن تو کیسا احمق ہے۔

دفعتاً وہ دروازے کی طرف بڑھی اور فیض الحسن کو آوازیں دینے لگی۔ وہ بھاگا ہوا آیا اور نسترن بانو اس سے کہنے لگی "دیکھو! آج کی رات ہم پر بھاری ہے۔ ہم جاگتے رہیں گے ورنہ میاں صاحب جسمانی طور پر بھی اصفہان چلے جائیں گے۔ . . . !"

"اچھا!" فیض الحسن نے حیرت سے کہا۔

"اگر یہ جسمانی طور پر بھی اصفہان پہنچ گئے تو ہندوستان تباہ ہو جائے گا۔"

"میں جاگتا رہوں گا بی بی صاحب۔" وہ بوکھلا کر بولا۔

میرا سر چکرا گیا۔ دل چاہ رہا تھا کہ اپنی زبان کاٹ کر پھینک دوں۔ دم بخود بیٹھا ٹکر ٹکر دونوں کو دیکھتا رہا۔ کہتا بھی تو کیا؟ اور وہ فیض الحسن کو سمجھا رہی تھی کہ کس کس طرح رات بھر نگرانی کی جائے۔ وہ سعادتمندانہ انداز میں سر ہلا ہلا کر سنتا رہا۔ کبھی کبھی خوفزدہ نظروں سے میری طرف بھی

دیکھ لیتا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ اٹھوں اور کم از کم اس نابکار کی گردن مروڑ دوں۔ اُسے ہدایات دے کر رخصت کر دیا اور میری طرف مڑ کر بولی "تم خواہ مخواہ مجھ سے اُلجھا کرتے ہو۔ ابھی تک تو ایسا ہوا نہیں کہ تمہارے لئے جو کچھ میں نے چاہا ہو پورا نہ ہوا ہو۔"

"تو پچھتائے گی۔" میں دانت پیس کر بولا۔

"پچھتاتی تو رہتی ہی ہوں۔ میرے لئے کوئی نئی بات نہ ہوگی۔"

"فی النار والسقر!" کہہ کر میں نے آنکھیں بند کرلیں۔

"وہاں بھی تم میرے ساتھ ہی رہو گے۔" اس نے کہا اور اپنے حجرے میں چلی گئی۔

میں نے خانقاہ کے دروازے کی طرف نظر اٹھائی۔ فیض الحسن غالباً باہر دروازے ہی پر موجود تھا۔ ذرا ہی دیر میں اس کی تصدیق بھی ہو گئی کیونکہ اسے کھانسی آئی تھی۔ آواز دروازے کے قریب ہی کی تھی۔

خداوندا اب کیا کروں؟ شاید میری سات پشتوں میں زیادہ تر احمق ہی گزرے تھے اور پدر بزرگوار کا کیا پوچھنا۔ کچھ تو تھے ہی سادہ لوح اوپر سے مادرِ محترمہ کے جلال و ہیبت کا سایہ۔ آئی گئی عقل غائب رہتی تھی۔ کہنا کچھ چاہتے تھے زبان سے کچھ نکلتا تھا۔ دوسروں سے سنا تھا کہ شادی سے پہلے ایسے نہیں تھے۔ رکھ رکھاؤ والے بھی تھے اور شاعری سے بھی شغف رکھتے تھے لیکن جب میں نے انہیں دیکھا ہے تو خوف الحواس کے علاوہ ان میں کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔

رہا ہو گا کچھ بہانا۔ تو نسترن بانو درپیش تھی۔ اب کیا ہوگا؟ فرار کی راہ بھی خود میں نے [illegible] کرلی۔ ڈر تھا کہیں قصبے سے نکل نہ

دو چار کو بلوالے . . .

لیکن خدا کا شکر ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ رات کا کھانا لانے والے کو نسترن نے ایسی کوئی ہدایت نہیں دی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ شاید نکل بھاگنے کا موقع مل ہی جائے، ضروری نہیں کہ وہ دونوں رات بھر جاگتے رہی رہتے۔

رات کے کھانے کے بعد نسترن بانو نے فیض الحسن کو خانقاہ کے اندر ہی روک لیا اور اُس سے بولی "بس اب یہیں ٹھہرو۔ میاں صاحب کی دیکھ بھال کے لیے۔"

پھر دونوں میرے سامنے ہی بیٹھ گئے اور میں تن بہ تقدیر ہو بیٹھا۔ تہیہ کر لیا تھا کہ خود بھی بیٹھوں گا اور ان دونوں کو اسی طرح بٹھائے رکھوں گا شاید تقدیر یاوری کرے اور وہ تھک کر سو جائیں۔ پھر خیال آیا کہ نہیں ابوالحسن اگر تو بیٹھا رہا تو یہ بھی مسلسل جاگتے رہنے کی کوشش کرتے رہیں گے، لہٰذا لیٹ جاؤ اور تھوڑی دیر بعد یہ ظاہر کرو جیسے بالکل غافل ہو گیا ہو تبھی ان کی توجہ تیری طرف سے ہٹے گی اور یہ بھی اونگھنا شروع کر دیں گے۔

بس تو پھر میں اللہ کا نام لے کر لیٹ گیا اور تھوڑی دیر بعد ایسا بن گیا جیسے کب... کے غفلت طاری ہو گئی ہو۔

وہ دونوں بیٹھے اِدھر اُدھر کی ہانکتے رہے تھے، لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ بار بار فیض الحسن مجھے موضوعِ گفتگو بنانے کی کوشش کرتا ہے لیکن نسترن اُس کی بات کاٹ کر کوئی اور قصہ لے بیٹھتی ہے۔

کئی ساعتیں اسی طرح گزر گئیں اور میں آنکھیں بند کئے پڑا جاگتا رہا۔ کبھی کبھی آنکھوں میں درہ کر کے ان کی طرف بھی دیکھ لیتا، وہ خاموش ہو گئے

تھے لیکن ان کی آنکھیں اب بھی کھلی ہوئی تھیں۔

میں غصے سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ بکواس کر کر کے تھک گئے تھے، لیکن نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دُور ہوئی تھی۔

اور پھر یک بیک مجھ پر نیند کا حملہ ہوا۔ لاکھ آنکھیں پھاڑیں جسم میں چٹکیاں لیں مگر نیند بے ہوشی کی طرح مجھ پر طاری ہوتی چلی گئی اور میں یہی سوچتے سوچتے غافل ہو گیا کہ اب دُنیا کی کوئی طاقت مجھے اس شادی سے نہیں بچا سکتی۔

دوبارہ آنکھ کھلتے ہی سب سے پہلے یہی خیال آیا تھا کہ بس اب مارا گیا۔ آنکھیں پھر بند کر لیں اور دم سادھے پڑا رہا۔ پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں کانوں میں آ رہی تھیں۔ صبح ہو گئی تھی لیکن . . . نسترن نے مجھے آوازیں نہیں دی تھیں۔ صبح کی نماز کے لیے وہی مجھے جگایا کرتی تھی۔ کبھی خود سے جاگنے کی توفیق مجھے نہیں ہوتی تھی۔ بات دراصل یہ تھی کہ ریاکاری کی اس زندگی میں خدا کے حضور جاتے ہوئے مجھے شرم آتی تھی اور میں کبھی دل سے نماز نہیں پڑھتا تھا۔ نسترن ہی جانماز تک بھی دھکیل لے جاتی تھی کہ یہ ضروری ہے اس پیشے میں۔ خود تو تھی ہی نماز کی پابند . . .

بہرحال میں آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بھی ابھی تک سو ہی رہی ہے۔ شاید فیض الحسن بھی نہیں جاگا۔ تو پھر کیوں نہ اسی وقت اُٹھ کر نکل کھڑا ہوں۔ ہو سکتا ہے تقدیر یاوری کرے اور قصبے کے کسی شخص سے بھی مڈبھیڑ ہوئے بغیر نکل جانے کا موقع مل جائے۔ جلدی سے اٹھ بیٹھا۔

"لیکن . . . ہائیں . . . یہ کیا . . . یہ میری خانقاہ تو نہیں تھی۔

خداوندا یہ کیا اسرار ہیں؟ کیا میں سچ مچ برگزیدہ ہو گیا ہوں ۔۔۔۔
لیکن رُوحانی دُنیا میں تو دھاندلی نہیں چلتی۔ پھر میں کہاں ہوں؟ کیا نیند ہی
کے عالم میں دُنیائے فانی سے کوچ کر چکا ہوں اور کسی بھُولی بسری نیکی کے
عوض مجھے جنّت کا یہ گوشہ عطا کر دیا گیا ہے ۔۔۔
الٰہی! کچھ تو پتہ چلے کہ آخر مجھ پہ کیا گزری۔

ایک بار پھر میرا سر زور سے چکرایا اور میں گہری تاریکیوں میں
ڈوبتا چلا گیا۔ اتھاہ گہرائی، تاریکی ہی تاریکی۔ گھُٹا ٹوپ اندھیرا ―

ختم شد